انوشا اور چندر گپت موریہ
محمد یونس حسرت

انوشا کی آپ بیتی

چوتھا حصّہ

انوشا اور چندر گپت موریا

بچوں کے لئے ناول

محمد یونس حسرت

فیروز سنز پرائیویٹ لمیٹڈ

فہرست

انوشا کی آپ بیتی

انوشا کی اِس حیرت انگیز اور پُر اسرار آپ بیتی کا آغاز آج سے کوئی ڈھائی ہزار سال پہلے اُس وقت ہوتا ہے، جب یونان کی ایک چھوٹی سی ریاست مقدونیہ کے بادشاہ فلپ (فیلقوس) کے بیٹے سکندر نے اپنے مُنہ زور سیاہ گھوڑے بیوسی فالس کی باگیں مشرق کی طرف پھیری تھیں اور ایران کی عظیم سلطنت کو روندتا ہوا پنجاب تک آ پہنچا تھا۔ پھر تاریخ کے دھارے کے ساتھ ساتھ بہتے ہوئے یہ داستان تاریخ کے اُس نازک اور فیصلہ کُن لمحے پر ختم ہوتی ہے۔ جب دریائے جہلم کے کنارے شیش ناگ کے بیٹے چندر گُپت موریہ نے سیلوکس کو شکست

فاش دی تھی۔ میں اُس جگہ جہاں اِس سے پہلے سیلوکس کے آقا سکندر نے راجا پورس پر فتح پائی تھی۔

سکندر نے وادیٔ کابل فتح کرنے کے بعد ۳۲۷ ق م میں، وادیٔ سندھ کا رُخ کیا تھا جسے اُس زمانے میں سپت سندھو یعنی سات دریاؤں کی سرزمین کہا جاتا تھا۔ سات دریاؤں کی یہ سرزمین چھوٹی چھوٹی خود مختار ریاستوں میں بٹی ہوئی تھی اور یہ ریاستیں اکثر آپس میں لڑتی پڑتی رہتی تھیں۔

درّہ مالاکنڈ کے شمال میں اشواک قبیلے کی حکومت تھی، جس کا صدر مقام مساگا تھا۔ پشکلاوتی میں (جس کے کھنڈر آج بھی چارسدہ مردان کے قریب موجود ہیں) گندھرو قوم کے کنٹک قبیلے کا راج تھا۔ ہزارہ اور بھمبر کی پہاڑیوں میں راجا ابھی سار حکومت کرتا تھا۔

راجا ابھی سار کی ریاست کے جنوب میں ٹیکسلا کی ریاست تھی جو سندھ سے جہلم تک کے درمیانی علاقے میں پھیلی ہوئی تھی۔ ٹیکسلا کا راجا امبھی تھا۔ جہلم اور

چناب کے درمیانی علاقے پر راجا پورس کی حکومت تھی جو پوروخاندان سے تعلّق رکھتا تھا۔ ٹیکسلا کا راجا امبھی اُس کا بہت بڑا دُشمن تھا۔ چناب سے راوی تک کا علاقہ پورس کے ایک رشتے دار کے قبضے میں تھا۔

راوی کے پار کاتھی قبیلے کی حکومت تھی جس کا صدر مقام سانگلا تھا۔ یہ شہر امرتسر سے کُچھ اوپر گورداسپور کے ضلع میں تھا۔

سندھ، جہلم، چناب اور راوی کے علاقوں میں مختلف قبیلوں کی حکومتیں تھیں جن میں ملّہی، سیوی، یادیو اور کشودراک خاص طور سے اپنی شجاعت اور حوصلہ مندی کے لیے مشہور تھے۔

انوشا ٹیکسلا کے راجا امبھی کا بڑا بیٹا تھا۔ اُس نے ٹیکسلا کے راج محل میں آنکھ کھولنے کے باوجود ٹیکسلا سے دُور اپنی ننھیال پشکلاوتی میں شیش ناگ کے سائے میں پرورش پائی تھی، صرف اِس لیے کہ نجومیوں کے کہنے کے مطابق راج محل میں رہنا اور راج پاٹ سنبھالنا اُس کی قسمت میں نہ تھا۔

انوشا کا بچپن ناگوں کے ساتھ کھیلتے گزرا تھا۔ زندگی کے ہر موڑ پر شہروں میں، بستیوں میں، راج محلوں میں، جنگلوں میں، وہ جہاں بھی گیا، اُس کا سامنا ناگوں سے ہوتا رہا۔ اس کا ایک قدم انسانوں کی دُنیا میں تھا اور دوسرا ناگوں کی دُنیا میں۔ اکثر یہ دونوں دُنیائیں یوں گڈ مڈ ہو جاتی تھیں کہ وہ یقین سے نہیں کہہ سکتا تھا کہ انسانوں کی دُنیا کون سی ہے اور ناگوں کی دُنیا کون سی۔

اپنی زندگی کے پہلے دس سال اُس نے پشکلاوتی میں گزارے، اور پھر اپنی ماں کے مرنے پر کشمیر کے ایک شہر پرورپور کی طرف چل دیا۔ پرورپور میں اُس کی بڑی خالہ رہتی تھی، جِس کا شوہر وہاں تکشک ناگ کا پروہت تھا۔ کشمیر کی طرف جاتے ہوئے جب وہ ٹیکسلا سے گزرا تو اُسے خبر ملی کہ چند روز پہلے راجا امبھی اور راجا پورس کے درمیان ایک خوفناک لڑائی ہوئی ہے جس میں پورس نے امبھی کو بُری طرح شکست دی ہے۔ وہ اِس خبر پر کان دھرے بغیر آگے بڑھ گیا تھا اور اُسے گمان تک نے تھا کہ ایک روز وہ تاریخ کے دھارے کے ساتھ بہتا ہوا ٹیکسلا آئے گا۔ نہ صرف ٹیکسلا آئے گا بلکہ ٹیکسلا سے مگدھ کے دار السّلطنت پاٹلی پُتر

تک جائے گا۔ (مگدھ کی سلطنت اُس جگہ آباد تھی جہاں اب بھارت کا صوبہ بہار آباد ہے۔ بہار کے دارالحکومت پٹنہ کا پرانا نام پاٹلی پُتر تھا۔)

انوشا اپنی خالہ کے پاس پرور پور پہنچا تو اندھیر نگری کے دِل چسپ واقعے کے بعد اُس کی ملاقات سارنگ بابا سے ہو گئی اور وہ اُن کے ساتھ ہو لیا۔ سارنگ بابا کی بدولت انوشا کی زندگی میں وہ وہ واقعات پیش آئے جِن کا وہ تصوّر بھی نہیں کر سکتا تھا۔ اُس نے ایک چودہ ہاتھ لمبے ناگ سے زندگی اور موت کی جنگ لڑی۔ ایک ایسا ناگ اُن کے ہاتھ سے نکل گیا جسے ابھی ناگ سے انسان بننے کی طاقت حاصل نہیں ہوئی تھی۔ پھر سارنگ بابا اور انوشا نے ایک عورت کے جسم سے سانپ نکالا جو اُس کے پیٹ میں جونک کی طرح چمٹا اُس کا خُون چُوس رہا تھا۔ یہ عورت سارنگ بابا کے ایک دوست سردار کی بیوی تھی۔ سردار نے اپنی بیوی کی بیماری دُور ہونے کی خوشی میں ایک جشن کیا۔ اِس جشن میں طرح طرح کے کھیل تماشے ہوئے اور پھر ایک سپیرا سارنگ بابا کے مُقابلے پر آیا۔ اِس مقابلے کے نتیجے میں سارنگ بابا اور انوشا کو وہ سانپ ہاتھ آیا جو اپنی پھُنکار سے پتھّر کو

ریزہ ریزہ کر دیتا تھا۔ صرف یہی نہیں، اُس کی پھُنکار سامنے کی چیزوں کو خشک لکڑی کی طرح جلا ڈالتی تھی، خواہ وہ چیزیں جان دار ہوں یا بے جان، سارنگ بابا نے اُس کا نام شانی رکھا اور اُسے انوشا کا دُودھ شریک بھائی بنا دیا۔

پھر ایک پہاڑی بستی کے قریب ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس نے ثابت کر دیا کہ شانی واقعی انوشا کو اپنا بھائی سمجھتا ہے۔ شانی کئی دِن کا بھوکا پیاسا تھا اور سارنگ بابا انوشا اور شانی کو ایک غار میں ٹھہرا کر دُودھ لینے گئے ہوئے تھے کہ بارش اور آندھی آ گئی۔ پھر ایک بھاری چٹّان نے اُوپر سے لُڑھک کر غار کا دروازہ بند کر دیا۔ ایسے میں شانی نے غار کے دروازے پر پڑی ہوئی چٹّان کو ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا اور یوں انوشا کو غار کی قید سے نِجات دلائی۔

پھر سارنگ بابا انوشا کو ساتھ لیے ویری ناگ کے چشمے پر پہنچے۔ ویری ناگ میں انوشا نے سُنہری ناگ کو ایک خوف ناک مُقابلے میں ہرا دینے کے بعد اُس کا مَن حاصل کیا، جسے سارنگ بابا نے دُودھ میں حل کر کے انوشا کو پلا دیا۔ اِس مَن

کی بے پناہ طاقت کو اپنے جسم میں جذب کرنے کے لیے انوشا کو چالیس دِن کا فاقہ کرنا پڑا جس کے بعد سُنہری ناگ نے اُس کی دعوت کی۔

پھر وہ پانی کے راجا کی اِس دعوت کے بعد شہر بھوگ متی کے راجا ناگ سین کے محل میں پہنچے۔ وہاں راجا ناگ سین کے جوگی بھائی کی لاش کے ساتھ انوشا کا نہایت خُوف ناک مُقابلہ ہوا۔ انوشا نے اِس مُقابلے میں جیت کر اُس لاش کی زبان حاصل کی جو بتاشے کی طرح اُس کے مُنہ میں گھُل گئی۔

پھر وہ ایک ایسی بستی میں پہنچے جہاں ایک نوجوان کو سانپ نے ڈس لیا تھا، اور یہ سانپ اُس کے جسم سے چھٹا ہوا تھا۔ سارنگ بابا نے اُس سانپ کی جان کو اُس نوجوان کے جسم میں ڈال دیا اور سانپ کی راکھ احتیاط سے اپنے پاس رکھ لی۔ اِس کے بعد سارنگ بابا اور انوشا کیسر ناگ کے جنگل کی طرف چل دیے۔

کیسر ناگ کے جنگل میں اُن کا کیسر ناگ کے ساتھ خوف ناک مُقابلہ ہوا، جو چودھویں رات کی چاندنی میں اپنے بھاری بھرکم اژدھے پر سوار ہو کر جنگل کی

سیر کو نکلتا تھا۔ بڑی مُشکلوں کے بعد جب سارنگ بابا نے کیسر ناگ کو قابو میں کیا تو اُس کا آدھا حصّہ خود کھا گئے اور آدھا حصّہ زبردستی انوشا کو کھِلا دیا۔ اِس کے ساتھ ہی انوشا پر بے ہوشی طاری ہو گئی۔

انوشا کو ہوش آیا تو اُس نے اپنے آپ کو اور سارنگ بابا کو اُس میدان میں پایا جہاں سے انہیں شانی ہاتھ آیا تھا۔ یہیں سے اُنہیں سفید اور سُرخ ہیرے ملے۔ سارنگ بابا کے کہنے کے مطابق سفید ہیرے تکشک ناگ اور سُرخ ہے شیش ناگ کی امانت تھے۔

انوشا سارنگ بابا کے ساتھ پرور پور پہنچا۔ سفید ہیرے تکشک ناگ کی نذر کیے اور پھر اپنی خالہ سے ملنے کے بعد سارنگ بابا کے ساتھ پرور پور کے محل میں پہنچا جہاں سارنگ بابا کا بھتیجا اور پرانا چیلا رامو راجا رام بن کر راج کر رہا تھا۔ اُس کی شادی سیالکوٹ کے راجا کی بیٹی رانی چندا سے ہو گئی تھی اور چند مہینے پہلے ہی رانی چندا نے ایک لڑکے رتن کو جنم دیا تھا۔ رتن کی پیدائش پر راجا سیالکوٹ نے اپنی

بیٹی کو چاندی کے شیر کا تحفہ بھیجا تھا۔ سارنگ بابا نے راجا سیالکوٹ کو تحفہ دینے کی خاطر ایک ہاتھی کو سونے کا بنا دیا۔

سارنگ بابا اور انوشا سونے کے ہاتھی کے ساتھ ساتھ خود بھی سیالکوٹ پہنچے۔ وہاں اُنہوں نے رانی چندا کی چھوٹی بہن چمپا کو ایک سانپ کے پنجے سے نجات دِلائی۔ یہ سانپ اتّفاق سے وہی تھا جو ایک بار اُن کے قابو سے نِکل بھاگا تھا۔ چمپا کی شادی راجا پورس کے چھوٹے بیٹے امر سے ہوئی تھی۔ امر اور چمپا کے ساتھ سارنگ بابا اور انوشا بھی سیالکوٹ سے راجا پورس کے دربار میں پہنچ گئے۔

چمپا کے آنے کی خوشی میں پورس کے دربار میں ایک جشن ہوا جس میں پورس کے دربار کی نامور رقّاصہ اُوشا نے انوشا کی بین کی دُھن پر اپنے ناچ کا کمال دِکھایا۔ پھر آدھی رات کے بعد اُوشا کے پالتو سانپ، امبر نے راجا پورس کے بڑے بیٹے کو ڈس لیا اور اِس کے ساتھ ہی اُوشا پُراسرار طور پر دربار سے غائب ہو گئی۔ سارنگ بابا نے راج کمار کا علاج کر کے اُسے ٹھیک کر دیا، مگر اُوشا کو پورس

کے سپاہی کوئی مہینہ بھر تلاش کرتے رہے۔ آخر جب پورس نے سارنگ بابا سے درخواست کی تو سارنگ بابا کے کہنے پر انوشا پل کی پل میں اُوشا کو ڈھونڈ لایا۔ راجا پورس کو یہ شک تھا کہ کہیں اُوشا نے یہ حرکت اُس کے پُرانے دُشمن امبھی کے کہنے پر نہ کی ہو۔ اُوشا کے واپس مل جانے کے بعد یہ شک تو دور ہو گیا مگر راجا پورس نے اُوشا کو اپنے دربار سے چلے جانے کا حکم دے دیا۔

اُوشا نے پشکلاوتی جانے کی خواہش ظاہر کی۔ سارنگ بابا اور انوشا اُوشا کو ساتھ لے کر پشکلاوتی جانے کے اِرادے سے ٹیکسلا کی طرف روانہ ہو گئے۔

جب وہ ٹیکسلا پہنچے تو سکندر بھی وہاں پہنچ چُکا تھا اور اُس نے آس پاس کے تمام پیروں اور جوگیوں کو اپنے لشکر میں جمع کرنے کا حکم دیا تھا۔ سارنگ بابا، انوشا اور اُوشا کو بھی راجا امبھی کے سپاہی سکندر کے پاس لے گئے۔ سکندر نے راجا امبھی کو ہدایت کی کہ انہیں ہمارے مہمان کے طور پہ محل میں رکھا جائے۔

ٹیکسلا ہی میں اُن کی ملاقات چندر گُپت سے ہوئی۔ وہ شیش ناگ خاندان کا شہزادہ

تھا جو نند خاندان کے ظلم و ستم سے بچتا بچاتا ٹیکسلا تک آ پہنچا تھا، تاکہ سکندر کی مدد سے مگدھ کا وہ کھویا ہوا راج پاٹ دوبارہ حاصل کر سکے جس پر نیچ ذات کے مہاپدم نند نے قبضہ کر لیا تھا۔

سارنگ بابا نے اُس کی مدد کرنے کا وعدہ کیا اور اُسے راجا امبھی کے ذریعے سکندر تک پہنچا دیا۔ مگر سکندر کو چندر گُپت کی باتوں سے ایسا غصّہ آیا کہ اُس نے چندر گُپت کے قتل کا حکم دے دیا۔ چندر گُپت جان بچا کر بھاگا اور سارنگ بابا کے حکم سے انوشا نے اُسے پل کی پل میں دریائے جہلم کے پار پہنچا دیا۔

پھر جب جشن کے موقع پر سارنگ بابا نے وہ سُرخ ہیرے، جو شیش ناگ کی امانت تھے، خود شیش ناگ کے حکم سے سکندر کو پیش کیے تو انوشا کو پانچ سپیروں کے ساتھ خُوف ناک مُقابلہ کرنا پڑا۔ انوشا نے اُن سپیروں پر فتح پائی اور سکندر نے خوش ہو کر سارنگ بابا، انوشا اور اُوشا کو اپنا صلاح کار بنایا۔

ٹیکسلا پہنچنے سے پہلے سکندر نے اشواک اور کنٹک قبیلوں کے علاقوں کو تباہ و برباد

کر دیا تھا۔ انوشا اور اُوشا کو سکندر کے ہاتھوں پشکلاوتی کی تباہی کا بڑا دُکھ تھا۔ اُوشا نے جوش میں آکر اپنے پالتو سانپ امبر سے سکندر اور اُس کی بیوی رُخسانہ کو ڈسوا دیا۔ امبر کے زہر نے سکندر پر تو کُچھ اثر نہ کیا مگر رُخسانہ کا بدن نیلا پڑ گیا۔ سارنگ بابا نے رُخسانہ کا علاج کیا اور وہ ٹھیک ہو گئی۔

پھر سکندر اور پورس کے درمیان دریائے جہلم کے کنارے جنگ ہوئی جس میں پورس نے شکست کھائی مگر وہ پورس کی شُجاعت اور غیرت نے سکندر کا دِل جیت لیا اور اُس نے اِس کی ریاست اِسے واپس کرنے کے علاوہ کُچھ اور علاقے بھی اُس کو واپس دے دیے۔

سکندر چناب پار کر کے سیالکوٹ پہنچا تو وہاں کے راجا نے اُس کی اطاعت قبول کر لی مگر جب وہ راوی کے پار گیا تو کاتھی راجا خم ٹھونک کر اُس کے مُقابلے میں آ گیا۔ سکندر نے سانگلا کی اینٹ سے اینٹ بجا دی اور اُس کے سترہ ہزار سپاہیوں کو موت کے گھاٹ اُتار دیا۔ اِس کے بعد سکندر کشمیر کے پہاڑوں کے ساتھ ساتھ

چلتا، قلعوں پر قلعے اور شہروں پر شہر فتح کرتا آگے بڑھتا رہا۔

پھر وہ راجا سوبھوتی کے شہر میں پہنچا۔ راجا نے اُسے اپنے پالتوں کُتّوں کے کرتب دِکھائے۔

سکندر بیاس کے کنارے پہنچا تو اُس کی فوج نے آگے جانے سے اِنکار کر دیا۔ کیوں کہ انہیں معلوم ہو گیا تھا کہ دریائے ستلج کے پار نند خاندان کی وہ عظیم سلطنت ہے جو مشرق میں سمندر کے پانیوں تک پھیلی ہوئی ہے۔ اُنہیں یہ بھی معلوم ہو گیا تھا کہ مگدھ کی اِس سلطنت کے راجا سُدھانند کے پاس چھ ہزار ہاتھی اور آٹھ ہزار جنگی رَتھ، اسّی ہزار گھُڑسوار اور دو لاکھ پیادہ سپاہی ہیں اور یہ کہ راجا سُدھانند گنگا کے کنارے پانی پُتر (جس کے کھنڈر موجود شہر پٹنہ کے پاس دریافت ہوئے ہیں) میں رہتا ہے اور اس کے خزانے سونے چاندی سے بھرے ہیں۔

سکندر نے سپاہیوں کی مرضی کے آگے سر جھُکا دیا اور بیاس کے کنارے دیوتاؤں

کے نام پر قربانیاں دینے کے بعد وہاں سے واپس ہوا۔ وہ جہلم پہنچا اور پھر دریا کے راستے سندھ اور جنوبی سمندر کی طرف روانہ ہوا۔ فوج کا ایک حصّہ دائیں کنارے پر اور دوسرا حصّہ بائیں کنارے پر حفاظت کے لیے ساتھ تھا۔

یہ "انوشا کی آپ بیتی" کے پہلے تین حصّوں کا خُلاصہ ہے۔ اِس سے آگے داستان آپ کے ہاتھوں میں ہے۔

سکندر کی واپسی

سکندر نے دیوتاؤں کی مرضی کے آگے سر جھکا دیا تھا۔ وہ سکندر جس نے اب تک شکست کا مُنہ نہیں دیکھا تھا اُس سکندر نے قدرت کی اَن دیکھی طاقتوں کے آگے ہتھیار ڈال دیے تھے۔

بچپن ہی میں اُس کی ہونہار طبیعت دیکھ کر لوگوں نے یہ کہنا شروع کر دیا تھا کہ وہ زیوس دیوتا کا بیٹا ہے۔ پھر جب وہ دریائے نیل کے دیوتا آمون رع کے مندر میں پہنچا تھا تو مندر کے پروہتوں نے اُسے آمون رع کا بیٹا بنا دیا تھا اور پھر اُس کے

کارناموں کی خبر پا کر اس کے ہم وطنوں نے بھی اُسے دیوتا مان لیا تھا اور وہ اُس کے مجسمے کے سامنے بھی قربانی کی رسم ادا کرتے تھے لیکن دریائے بیاس کے کنارے قدرت کی اَن دیکھی طاقتوں نے اُسے دوبارہ اُس کی اصل حیثیت کا احساس دلا دیا تھا۔

سکندر نے دریائے بیاس کے کنارے بارہ مینار تعمیر کرنے کا حکم دیا۔ اِس طرح وہ اُن دیوتاؤں کا شکریہ ادا کرنا چاہتا تھا جو اُسے یہاں تک لائے تھے اور اُس کے ساتھ ہی وہ اِن میناروں کو اپنی کامیابیوں کا نشان بھی بنانا چاہتا تھا۔

مینار تعمیر ہو گئے تو سکندر نے اُن پر دیوتاؤں کے نام پر قربانیاں دیں۔ اِس کے بعد اُس کے سپاہیوں کو جشن منانے کا حکم دیا۔ شاید یہ ویسا ہی جشن تھا جیسے جشن سکندر کے سپاہی دریائے سندھ عبور کرنے سے پہلے مناتے رہے تھے۔ لیکن ٹیکسلا والے جشن کے مقابلے میں یہ جشن بالکل روکھا پھیکا تھا۔

اور جب یہ سارا کچھ ختم ہو گیا تو سکندر نے اپنے سپاہیوں کو واپسی کا حکم دیا۔ اُس

نے ایک حسرت بھری نظر اُن بارہ میناروں پر ڈالی جو اُس نے اپنی واپسی کے نشان اور دیوتاؤں کے نام قربانیوں کے لیے تعمیر کرائے تھے۔ پھر اُس نے بیاس کے بہتے پانی کی لہروں کو دیکھا اور مگدھ کی اُس سلطنت کے بارے میں سوچا جو ستلج کے کناروں سے شروع ہر کر مشرقی سمندر تک پھیلی ہوئی تھی، جِس کی بے شمار دولت اور سونے چاندی سے بھرے خزانوں سے اُس کے سپاہیوں نے مُنہ موڑ لیا تھا اور واپس جانے کی رٹ لگانا شروع کر دی تھی۔ وہ اپنی فوج کے ساتھ واپس ہو لیا۔ خاموش اور چُپ چاپ۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے وہ اپنا دِل دریائے بیاس کے کنارے اپنے بنوائے ہوئے بارہ میناروں کے پاس ہی چھوڑ آیا ہے۔ اُس کے چہرے پر ہر وقت اداسی سی چھائی رہنے لگی۔

شاید یہ اُسی بدلی ہوئی طبیعت کا اثر تھا کہ اب سکندر نہایت چھوٹی چھوٹی چیزوں پر توجّہ دینے لگا تھا۔ جب راجا سوبھوتی کے علاقے سے گُزرا تو سوبھوتی نے اُس کو سونے کے وہ سِکّے پیش کیے جو اُس نے اپنی اور سکندر کی دوستی کی یادگار کے طور پر ڈھلوائے تھے۔ اِن سکّوں پر راجا سوبھوتی نے اپنا نام یونانی حروف میں کھدوایا

تھا، جو سوبھوتی کے بجائے، ''سوفائی لس'' پڑھا جاتا تھا۔

سکندر نے اگرچہ خاموشی اختیار کر لی تھی لیکن اُس کا ذہن خاموش نہیں تھا۔ وہ برابر سوچ رہا تھا کہ سپاہیوں کی ضد اور ہٹ دھرمی سے اُس کی مہم کو جو نقصان پہنچا ہے، اُس کی تلافی کس طرح کی جا سکتی ہے اور جب وہ اپنے سپاہیوں کو واپس لیے دریائے جہلم کے کنارے پہنچا تو اُس کا ذہن ایک فیصلے پر پہنچ چکا تھا اور جہلم کے کنارے پہنچ کر اس نے اپنے فیصلے کا اعلان کر دیا۔

سپاہی جس راستے سے آئے تھے، وہ اُنہیں اُس راستے سے واپس لے جانا نہیں چاہتا تھا۔ اُن کی ضد کے باعث وہ مشرقی سمندر تک نہیں پہنچ سکا تھا، اِس لیے اب خشکی کے راستے واپس جانے کے بجائے وہ دریا اور سمندر کے راستے واپس جانا چاہتا تھا تاکہ مشرقی سمندر کو نہ سہی، اِس جنوبی سمندر کو تو دیکھ لے جس میں جہلم کے سمندر کا پانی جا کر ِگرتا تھا۔ چنانچہ اُس نے دو ہزار جہازوں کی تیّاری کا حکم دیا اور جب جہاز تیّار ہو گئے تو وہ دریائے جہلم کے راستے سندھ اور جنوبی

سمندر کی طرف روانہ ہوا۔

جہاز آہستہ آہستہ روانہ ہوئے۔ سپاہی نعرے لگا رہے تھے اور ملّاح گا رہے تھے۔ دریا کے دونوں کناروں پر پورس اور امبھی کے سپاہی الوداعی گیت گاتے ہوئے، کنارے کنارے، جہازوں کے ساتھ جا رہے تھے۔

اِس کے ساتھ ہی سکندر نے یہ اِنتظام بھی کیا تھا کہ اُس کی فوج کا ایک حصّہ دریا کے دائیں کنارے کے ساتھ ساتھ اور دوسرا حصّہ بائیں کنارے کے ساتھ ساتھ چلے۔ یہ انتظام اِس لیے کیا گیا تھا کہ دریا کے کسی کنارے کی طرف سے سکندر کے بحری بیڑے پر حملہ نہ ہونے پائے اور اس دو ہزار جہاز اِن فوجوں کی حفاظت میں اطمینان سے سفر کر سکیں۔

لیکن خوشی اور اطمینان کی یہ فِضا جلد ہی ختم ہو گئی۔ سکندر کا بیڑا دریائے جہلم اور دریائے چناب کے سنگم پر پہنچا تو اُسے معلوم ہوا کہ آگے ملّی، سیوی، یادیو، کشودراک، سمبھا اور اگالاس نام کے قبیلے آباد ہیں، جو بغیر لڑے اُسے آگے

جانے کا راستہ نہیں دیں گے۔

یہ قبیلے کسی راجا کے ماتحت نہیں تھے، یہ سب کے سب جنگ جُو تھے اور اُن کے جوانوں کے دِل اُن کے قلعوں سے کہیں زیادہ مضبوط اور اُن کے حوصلے قلعوں کی فصیلوں سے کئی گُنا بُلند تھے۔ اُن کے لیے زندگی اور موت بچّوں کا کھیل تھی۔

ہر قبیلے کی اپنی اپنی فوج تھی۔ ملّی قبیلے کی فوج دس ہزار گھوڑوں اور نوّے ہزار سپاہیوں پر مشتمل تھی اور یہ وہ لوگ تھے جو اپنی بُلند ہمتی اور بہادری کے لیے مشہور تھے۔ سیوی قبیلے کی فوج چالیس ہزار پیادہ سپاہیوں پر مشتمل تھی اور یادیو قبیلہ پانچ سو رَتھ، چھ ہزار گھڑ سوار اور ساٹھ ہزار پیادہ سپاہی رکھتا تھا۔ اِسی طرح کشودراک سمبھا اور اگالاس قبیلے بھی اپنی اپنی فوجیں رکھتے تھے۔ چنانچہ سکندر کی فوجوں کو چناب اور جہلم کے سنگم سے آگے مسلسل لڑائیوں کا سامنا کرنا پڑا۔ سکندر نے اندازہ کر یا تھا کہ اگر یہ تمام قبیلے اُس کے خلاف متحد ہو گئے تو اُس کی فوج کا ایک سپاہی بھی جیتا نہ بچے گا اِس لیے اُس نے اُنہیں متحد ہونے کا موقع ہی

نہیں دیا۔ اِس کے باوجود ہر قبیلے نے اپنی اپنی جگہ سکندر کا یوں ڈٹ کر مُقابلہ کیا کہ اُس کے سپاہی پورس اور کاتھیوں کی جنگوں کو بھُول گئے۔ مگر سکندر آخر سکندر تھا اور اُس کے سپاہی اگرچہ بیاس سے آگے بڑھنے سے اِنکار کر چُکے تھے اور اب واپس ہو رہے تھے، لیکن یہ وہی سپاہی تھے جِن کی مدد سے سکندر نے آدھی دُنیا فتح کی تھی۔ اُن کی تلواریں ابھی کُند نہیں ہوئی تھیں۔ چنانچہ اُنھوں نے تباہی، بربادی اور قتلِ عام کو اپنا وتیرہ بنالیا۔ سکندر کے دِل میں یہ خیال پیدا ہو چُکا تھا کہ جہاں سے بھی گُزرے، مُقابلے کا کوئی نشان باقی نہ چھوڑے۔ جو قلعہ راستے میں آیا، اُس کی اینٹ سے اینٹ بجادی گئی۔ جو بستی سامنے آئی، اُسے تباہ و برباد کر دیا گیا۔ بعض اوقات وہ خود حملہ آور فوج کر ساتھ لے کر نکلتا اور بے گناہ لوگوں کے قتلِ عام میں پورے جوش و خروش سے حصّہ لیتا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اُس کے سر پر تباہی و بربادی اور قتل و غارت کا جنون سوار ہو گیا ہے۔

ملّہی قبیلہ اپنی آبادی اور فوج کے لحاظ سے دوسرے قبیلوں سے کہیں زیادہ مضبوط تھا، اِس لیے جب سکندر کا مُقابلہ ملّہیوں سے ہوا تو اُسے جلد ہی احساس ہو گیا کہ

ملّہی کوئی ترنوالہ نہیں ہیں۔

سکندر کے سپاہی ملّہیوں کے قلعے میں داخل ہونے کی کوشش کر رہے تھے لیکن ملّہیوں کے تیر اندازوں کے سامنے اُن کی کوئی پیش نہیں جا رہی تھی۔ سکندر نے بے صبر سا ہو کر خود دیوار کے ساتھ ایک سیڑھی لگوائی اور اوپر پڑھ گیا۔ تین اور سپاہی اُس کے پیچھے آئے۔ قلعے کے برجوں سے تیروں کی بارش ہو رہی تھی لیکن سکندر اور اُس کے تینوں سپاہی دیوار پر پہنچ گئے۔

پھر سپاہیوں کا ریلا سیڑھی کی طرف بڑھا اور وہ اُن کے بوجھ سے ٹوٹ گئی۔ سکندر دیوار پر بیٹھا رہتا تو کسی وقت بھی کسی تیر کی زد میں آسکتا تھا، اِس لیے وہ دیوار سے اندر کی طرف کُود گیا اور اُس کے پیچھے پیچھے تینوں سپاہی بھی کُود گئے۔ اُنہوں نے دیوار سے پیٹھ لگالی اور ملّہیوں کا مُقابلہ کرنے لگے۔

سکندر کا ایک سپاہی مارا گیا اور پھر ایک ملّہی تیر انداز نے تاک کر تیر جو چلایا تو وہ سکندر کی زرہ بکتر کو توڑتا ہوا اُس کے پھیپھڑے میں جا لگا۔ وہ کُچھ دیر کھڑا رہا

لیکن پھر غش کھا کر گِر پڑا۔ اُسے گرتے دیکھ کر ایک ملّہی تلوار سونت کر اُس کی طرف بڑھا کہ ایک ہی وار میں اُس کا کام تمام کر دے، لیکن سکندر کے سپاہیوں نے اُس کو اپنی اوٹ میں لے لیا۔

اِتنے میں سکندر کی فوج کے کُچھ اور سپاہی دیوار پر سے کُودے اور اُنہوں نے دروازہ توڑ ڈالا۔ ساری یونانی فوج قلعے کے اندر آ گئی۔ اُنہوں نے سکندر کو زخمی اور بے ہوش دیکھا تو اُن کی آنکھوں میں خُون اُتر آیا اور اُنہوں نے اِس قلعے کے ایک ایک فرد کو نہایت بے دردی سے قتل کر ڈالا۔ کوئی مرد، کوئی عورت کوئی بچّہ، کوئی جوان، کوئی بُوڑھا، ملّہیوں کے اِس قلعے میں اُن کے ہاتھوں سے زندہ نہیں بچا۔

سپاہی سکندر کو اُٹھا کر باہر لائے تو وہ زندگی اور موت کی کشمکش میں مُبتلا تھا۔ سکندر کی جگہ کوئی اور ہوتا تو ایسے شدید زخم کے بعد موت کی جیت ہوتی لیکن وہ سکندر تھا۔ اُس کی رگوں میں ناگ دیوتا کا خون تھا۔ اتنا شدید زخم کھانے کے باوجود وہ

زندہ رہا اور اُس کا زخم جلد ہی ٹھیک ہو گیا۔

جب تک سکندر کی حالت نازک رہی، فوج کی پیش قدمی رُکی رہی۔ جب اُس کا زخم بھر گیا تو اُس نے روانگی کا حکم دیا۔ لیکن ابھی اُس میں اتنی طاقت نہیں تھی کہ آسانی سے چل پھِر سکتا۔ اُس نے جہاز پر اپنے بیٹھنے کی جگہ اتنی اونچی بنوائی کہ اِرد گِرد کی فوج کو آسانی سے نظر آ جائے۔ جیسے جیسے جہاز چلتا تھا وہ اپنا ہاتھ اُوپر اُٹھاتا تھا تاکہ سپاہیوں کو یہ یقین ہو جائے کہ اتنا شدید زخم کھانے کے باوجود وہ اُن کے درمیان زندہ موجود ہے۔

پھر وہ دریائے سندھ پر پٹالا کے مقام پر پہنچ گئے۔ یہاں جہلم، چناب اور راوی کے علاوہ ستلج کا پانی بھی سندھ کے دریا میں شامل ہو جاتا تھا۔ اِس جگہ دریائے سندھ کا پاٹ اِتنا چوڑا تھا کہ اگر پانی بہنے کے بجائے کھڑا ہوتا تو دیکھنے والے اِسے سمندر خیال کرتے۔

اِس مقام پر سکندر نے دریا کے دیوتا آمون رع، آہورامزدا اور زیوس دیوتا کے

نام پر قربانیاں دیں۔ پھر اُس نے اپنے بحری بیڑے کو اپنے سالار نیار کس کی کمان میں دے کر اُسے ہدایت کی کہ وہ جنوبی سمندر میں پہنچ کر، ساحل کے ساتھ ساتھ چکّر لگاتے ہوئے دریائے دجلہ کے دہانے تک پہنچے۔ فوج کے ایک حصّے کو اُس نے اپنے دوسرے سالار کریروس کے حوالے کیا اور اُسے حکم دیا کہ وہ خُشکی کے راستے واپس جائے۔ فوج کے دوسرے حصّے کے ساتھ اُس نے اپنے بحری بیڑے کی امداد کے لیے ساحل کے ساتھ ساتھ سفر کرنے کا فیصلہ کیا۔

اِس کے لیے سکندر کو مکران کے صحرا سے گُزرنا تھا اور یہ راستہ بہت ہی دشوار گُزار تھا۔ سکندر کے ساتھی اُسے بتا چُکے تھے کہ یہ وہ راستہ ہے جو اِس سے پہلے فارس (ایران) کے ہنجا منشی خاندان کے بانی کورِدش اعظم اور بابل کی پُر اسرار ملکہ سیمی رامیسس نے اختیار کیا تھا اور یہاں سے گُزرتے ہوئے ان کی ساری فوج تباہ ہو گئی تھی۔ لیکن اس سے سکندر کا حوصلہ پست ہے نے بجائے اور بڑھ گیا۔ اس نے وہ کام کیا تھا جو اس سے پہلے کسی نے نہیں کیا تھا۔ وہ اس جگہ تک پہنچا تھا جہاں اس سے پہلے کوئی نہیں پہنچا تھا۔ اور اب وہ ایک ایسے راستے سے اپنی فوج

کے ساتھ سفر کرنا چاہتا تھا جہاں سے اب تک کورِدِش اعظم اور ملکہ سیمی رامیسس بھی اپنی فوجوں کو سلامتی کے ساتھ نہیں لے جا سکے تھے۔ اس سفر میں سکندر اپنے سپاہیوں کے ساتھ پیدل چلا اور ان کے ساتھ بھوک پیاس اور سفر کی تکلیفیں برداشت کیں اور آخر کار فارس جا پہنچا۔ وہاں نیارکس بھی اُس سے آ ملا اور اُس کے بعد کریروس بھی آ پہنچا۔

فارس میں شوش کے مُقام پر پہنچ کر سکندر نے ایک بہت بڑے جشن کا انتظام کیا۔ یہاں اُس نے اپنی اور اپنے اسّی افسروں کے علاوہ دس ہزار سپاہیوں کی شادیاں کیں۔ اپنے لیے اُس نے شاہ دارا کی بڑی لڑکی کو منتخب کیا اور دارا کی چھوٹی لڑکی کو اپنے ایک سالار کی بیوی بنایا۔ رُخسانہ کی چھوٹی بہن کی شادی اُس نے کریروس سے کر دی۔

پھر وہ بابُل کی طرف روانہ ہوا۔ بابُل کو وہ اپنی سلطنت کا مرکز بنانا چاہتا تھا۔ بابُل کے باہر ہی اُسے مردوخ دیوتا کے پرہت ملے اور اُنھوں نے کہا:

"سکندر! تُو بابُل کے اندر نہ جا۔ وہاں جائے گا تو تُجھ پر آفت نازل ہو گی۔"

سکندر کے کُچھ ساتھیوں نے مشورہ دیا کہ پروہتوں کی بات مان لینا چاہیے لیکن اُس کے کُچھ دوسرے ساتھیوں نے یہ رائے دی کہ یہ پروہت مندر کے دوبارہ بن جانے کی وجہ سے بے حد دولت مند ہو گئے ہیں اور نہیں چاہتے کہ سکندر شہر میں پہنچے اور اُن کے حساب کتاب کی جانچ پڑتال کرے۔

یہاں سکندر کو یاد آیا کہ بابُل کی فتح کے بعد جب اُس نے مردوخ دیوتا کا تباہ شُدہ مندر دوبارہ تعمیر کرانے کا حکم دیا تھا تو مقدونیہ کے بُوڑھے کاہن ایرستاندر نے اُس کی مخالفت کی تھی اور کہا تھا کہ مندر دوبارہ تعمیر کرنے کی اجازت نہیں دینی چاہیے۔ اب ایرستاندر اِس دُنیا سے رُخصت ہو چکا تھا۔ سکندر نے پروہتوں کی بات کو کوئی اہمیّت نہ دی۔ وہ شہر میں داخل ہو گیا اور سیدھا اُس محل میں پہنچ گیا جو کبھی بادشاہ بخت نصر کا محل ہوا کرتا تھا۔

نیارکس نے اپنے بحری سفر کے جو حالات سُنائے تھے اُن سے سکندر کے دِل میں

یہ اشتیاق پیدا ہو گیا تھا کہ وہ عرب کے ساحل کے ساتھ ساتھ ہوتا ہوا مصر پہنچے۔ اُس نے نیارکس سے کہا۔

"ہم عرب کی سرزمین کے اِرد گرد چکّر ضرور لگائیں گے۔ تُم جہاز لے کر ساحل کے ساتھ ساتھ چلو گے اور میں خود خُشکی کے راستے جاؤں گا۔ اِس طرح ہم دریائے نیل کی سرزمین پر پہنچ جائیں گے اور اُن رازوں پر سے پردہ اُٹھائیں گے جو ابھی تک انسانی نگاہوں سے پوشیدہ ہیں۔" سکندر کے حکم کے مطابق بابُل میں جہاز سازی شروع ہو گئی اور دس دس، تیس تیس چپّوؤں والے جہاز بننے گے۔ لیکن ابھی جہاز روانہ ہونے نہ پائے تھے کہ سکندر کو بخار نے آلیا، اور وہ سکندر جس پر اُوشا کے پالتو سانپ امبر کے زہر کا کُچھ اثر نہ ہوا تھا، وہ سکندر جو ملّھیوں کے قلعے میں شدید زخمی ہو کر بھی زندہ سلامت رہا تھا، وہ سکندر جو بڑے بڑے خطروں میں پڑ کر بھی محفوظ رہا تھا، وہ سکندر جِس نے پورس اور کاتھی راجا پر فتح حاصل کی تھی، وہ سکندر جس کی رگوں میں ناگ دیوتا کا خُون تھا، وہی سکندر بخت نصر کے محل میں چند روز بخار میں مُبتلا رہ کر اِس دُنیا سے رُخصت ہو گیا۔ موت

کے وقت اُس کی عمر صرف بتّیس سال آٹھ مہینے تھی۔

چندر گُپت اور چانکیہ

مُجھے یہ سب کُچھ ایک بھیانک خواب سا لگتا تھا۔

جب سارنگ بابا اور میں مہاراجا پورس کے ہاں سے اُوشا کو ساتھ لے کر چلے تھے تو اُوشا کو پشکلاوتی کے شیش ناگ کے مندر تک لے جانے کے علاوہ اور کوئی بات میرے ذہن میں نہیں تھی۔ پھر جب ہم ٹیکسلا پہنچے تھے تو میرا ارادہ یہی تھا کہ رات ٹیکسلا میں گزارنے کے بعد ہم پشکلاوتی کی طرف روانہ ہو جائیں گے۔

مگر انسان سوچتا کُچھ ہے اور ہوتا کُچھ ہے۔ ٹیکسلا میں رات بسر کرنے کے بعد

تقدیر کا زبردست ہاتھ ہمیں سکندر کے پاس لے گیا تھا اور پھر سکندر کی واپسی تک ہم یوں اُس کے ساتھ رہے تھے جیسے آدمی کا سایہ اُس کے ساتھ رہتا ہے۔ سکندر واپس چلا گیا تھا لیکن وہ بھیانک خواب ابھی ختم نہیں ہوا تھا۔ سکندر نے واپس جانے سے پہلے اپنے فتح کیے ہوئے علاقوں کو چار حصّوں میں بانٹ دیا تھا۔ دریائے سندھ کے پار کے علاقے اُس نے اپنی بیوی رُخسانہ کے باپ کے سپُرد کر دیے تھے۔ سندھ اور جہلم کا درمیانی علاقہ ٹیکسلا کے راجا امبھی کے پاس ہی رہنے دیا تھا۔ دریائے جہلم سے لے کر دریائے بیاس تک کا درمیانی علاقہ اُس نے مہاراجا پورس کے حوالے کر دیا تھا اور چناب اور جہلم کے سنگم سے نیچے ملّہی، سیوی، یادیو، کشودراک، سمبھا، اگالاس اور دوسرے قبیلوں کا علاقہ اُس نے ایک اپنے ہم وطن افسر اور اپنے باپ کے ہم نام فِلپ کی نگرانی میں دے دیا تھا جو اُس کے ایک اور سالار ہارپالوس کا بھائی تھا۔

فتح کیے ہوئے علاقوں میں جہاں سکندر نے پُرانے قلعے اور شہر تباہ و برباد کیے تھے، وہاں کئی نئے شہر بسائے بھی تھے۔ ایسے تمام شہروں میں اُس نے اپنے ان

ہم وطنوں کو آباد کیا تھا جو بیمار یا زخمی ہو جانے کے باعث یا کسی اور وجہ سے اُس کی فوج کے ساتھ نہیں جا سکتے تھے۔ یہ شہر ایک طرح سے یونانی چھاؤنیوں کی حیثیت اختیار کر گئے تھے۔ اُن میں زیادہ تر شہر دریائے بیاس اور دریائے جہلم کے درمیان تھے اور یہ وہ علاقہ تھا جو سکندر نے جاتے ہوئے پورس کو دے دیا تھا۔

سکندر کے ہوتے ہوئے کسی کو مجال نہ تھی کہ اِن شہروں کے کسی چھوٹے سے چھوٹے آدمی کی طرف آنکھ اُٹھا کے بھی دیکھ سکے۔ لیکن سکندر کے جاتے ہی حالات بدل گئے اور وہاں کے لوگ اِن یونانی لوگوں کے خلاف اُٹھ کھڑے ہوئے۔ ابھی سکندر بابُل تک نہ پہنچا تھا کہ جگہ جگہ یونانیوں پر حملے ہونے لگے۔ اِن حملوں میں چندرگُپت سب سے پیش پیش تھا۔ وہ چندرگُپت جو پاٹلی پُتر کے شیش ناگ کا بیٹا تھا۔

چندرگُپت اب وہ شہزادہ نہیں تھا جو نند خاندان کے خُوف سے اپنی جان بچاتا اور

در در پھِرتا سکندر کے پاس پہنچا تھا۔ جب میں نے اُسے ٹیکسلا سے اُٹھا کر جہلم کے پار پہنچایا تھا تو وہ سیدھا پورس کے پاس چلا آیا تھا۔ پورس اُسے اپنے دربار میں رکھنے کے لیے تیّار تھا، لیکن چندر گُپت نے ہوا میں خطرے کی بُو سُونگھ لی تھی۔ اِس لیے وہ پورس کے دربار میں رہنے کے بجائے کشمیر کی طرف نکل گیا تھا اور پونچھ اور راجوری کے راجا پردانک کے پاس جا پہنچا تھا۔ اس کی غیر معمولی قابلیت سے متاثر ہو کر راجا پردانک نے اپنی بیٹی کی شادی اُس سے کر دی اور یوں وہ ریاست اور اُس کی فوج کا مالک بن گیا تھا۔

اِس درمیان میں ایک اور شخص بھی چندر گُپت سے آملا تھا۔ یہ شخص مگدھ کے راجا سدھانند کا وزیر تھا۔ وہ ایک پڑھا لکھا اور قابل شخص تھا، لیکن تھا بد شکل۔ اُس کی ٹانگیں بھی ٹیڑھی میڑھی تھیں۔ ایک بار نند خاندان کے راجا سدھانند نے پاٹلی پتر میں ایک جشن کا انتظام کیا۔ اِس موقع پر لاکھوں روپے اور بہت سی قیمتی چیزیں دان کی گئیں۔ اِس جشن میں اور لوگوں کے علاوہ چانکیہ کو بھی بُلایا گیا تھا۔ وہ اگلی قطار میں جا بیٹھا۔ راجا سدھانند جشن میں آیا اور اُس نے ایک بھدّے

اور بد شکل شخص کو اگلی قطار میں بیٹھے دیکھا تو اُسے جشن کے لیے بُرا شگون سمجھتے ہوئے چانکیہ کو جشن سے نکلوا دیا۔ بھرے دربار میں یوں بے عزّت ہونے پر چانکیہ نے غصّے سے اپنا کشکول زمین پر دے مارا اور قسم کھائی کہ جب تک مگدھ کی سلطنت کو تباہ نہیں کرے گا، چین سے نہیں بیٹھے گا۔

چانکیہ اپنے دِل میں انتقام کی آگ چھپائے پاٹلی پُتر سے نِکلا اور کُچھ عرصے تک ایک سادھو کے بھیس میں وندھیاچل کی پہاڑیوں میں پھِرتا رہا۔ اِس کے بعد وہ جگہ جگہ پھرتا رہا اور سوچتا رہا کہ مگدھ کے راجا سدھانند سے اپنی بے عزّتی کا بدلہ کیسے لے سکتا ہے؟ پھر تقدیر کا ہاتھ اُسے چندر گُپت کے پاس لے آیا۔

دونوں کو ایک دوسرے سے مل کر یوں محسوس ہوا جیسے اُنہیں اپنی منزل تک پہنچنے کا راستہ مل گیا ہے۔ چندر گُپت اور چانکیہ دونوں کی منزل مگدھ کی راجدھانی پاٹلی پُتر تھی۔

چندر گپت ٹیکسلا میں سکندر سے مل چکا تھا اور وہ تباہی اور بربادی بھی اُس کے

سامنے تھی جسے سکندر پشکلاوتی سے بیاس تک اپنی نشانی کے طور پر چھوڑ گیا تھا۔ سکندر کے مرنے پر جب اُس کے جرنیل آپس میں لڑنے لگے تو چند گُپت اور چانکیہ نے اِسے اپنے لیے ایک سنہری موقع سمجھا اور نفرت کی اِس آگ کو اور زیادہ ہوا دینے لگے جو یہاں کے لوگوں میں یونانیوں کے خلاف پہلے ہی موجود تھی۔

پھر ایسا ہوا کہ ایک سر پھِرے یونانی نے کسی بات پر طیش میں آ کر راجا پورس کو قتل کر ڈالا۔ یہ ایک ایسی بات تھی جسے اِس دھرتی کا کوئی بھی سپوت برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ چندر گُپت اپنے سُسر پر دانک کی فوج لے کر پُونچھ کت پہاڑوں سے اُترا اور میدانی علاقے میں آتے ہی ہی اُس نے یونانیوں کے خلاف جنگ کا اعلان کر دیا۔ چھوٹے بڑے تمام قبیلے چندر گُپت سے مل گئے۔ اُنہوں نے پہلے سکندر کے یونانی افسر فلپ کو موت کے گھاٹ اُتارا، اور پھر تمام یونانی باشندوں کو بڑی چُن چُن کر قتل کرنے لگے۔ اِس علاقے کے لوگ چندر گُپت کی اِن کوششوں میں دِل اور جان سے اُس کے ساتھ تھے۔ قدرت نے پورس کے

بدلے اُنہیں چندر گُپت دے دیا تھا۔ اور پھر قُدرت نے وہ دِن بھی دِکھایا کہ سندھ سے بیاس تک اور ٹیکسلا سے پٹالا تب وہ تمام علاقے جنہوں نے سکندر کے قدم دیکھے تھے، اب چندر گُپت کو اپنا حاکم مان چکے تھے۔ وہ یہاں کے چھوٹے بڑے تمام قبیلوں کا راجا بن چُکا تھا۔

چندر گُپت سندھ اور جہلم کے درمیانی علاقے کا بھی راجا بن چُکا تھا۔ یہ وہ علاقہ تھا جسے سکندر نے پہلے، کی طرح راجا امبھی کے پاس ہی رہنے دیا تھا۔ میرا باپ ہوا کا رُخ بڑی جلدی پہچان لیتا تھا۔ وہ امبھی جس نے پورس کی دُشمنی کی خاطر اِس سر زمین کے دروازے سکندر پر کھول دیے تھے، اب اُس کے جانے کے بعد اُس کے تمام احسانوں کو بھول کر چندر گُپت کی اطاعت قبول کر چکا تھا۔

چندر گُپت کو اُس نے اطاعت کا پیغام اُس وقت بھیجا تھا جب وہ پُونچھ کی پہاڑیوں سے اُتر کر میدانی علاقے میں آیا تھا اور اُس نے یونانیوں کے خلاف جنگ کا اعلان کیا تھا اور راجا پورس کے قاتلوں سے انتقام لینے کے بعد اُس کے محل میں بیٹھا

یونانیوں کے خلاف اپنی کامیابی پر خوشی منارہا تھا۔

راجا امبھی نے اطاعت کا پیغام بھیجنے کے ساتھ ساتھ چندر گُپت کو ٹیکسلا آنے کی دعوت بھی دی تھی۔ شاید وہ چندر گُپت کا استقبال اُسی طرح کرنا چاہتا تھا جس طرح اُس نے سکندر کا استقبال کیا تھا۔

چندر گُپت نے راجا امبھی کی یہ دعوت قبول تو کرلی تھی لیکن اُسے کسی بعد کے موقع کے لیے اُٹھا رکھا تھا۔ اور وہ موقع اب آگیا تھا۔ اب کہ وہ دریائے بیاس سے لے کر دریائے سندھ تک اور کشمیر کی پہاڑیوں سے لے کر جنوب کے سمندر تک تمام علاقوں کا بادشاہ بن چکا تھا، تو وہ پاٹلی پُتر کا رُخ کرنے سے پہلے ٹیکسلا میں راجا امبھی کی دعوت کا لُطف اُٹھا کر ذرا تازہ دم ہو جانا چاہتا تھا۔

چندر گُپت نے جب سے پُونچھ کی پہاڑیوں سے سے اُتر کر یونانیوں کے خلاف کارروائی شروع کی تھی، اُس وقت سے ہم راجا پورس کے محل میں ٹھہرے ہوئے تھے اور کہیں نہیں۔ گئے تھے۔ میں نے کئی بار سوچا تھا کہ اب کیا کرنا چاہیے اور

کہاں جانا چاہیے؟ لیکن سارنگ بابا سے اِس بارے میں کوئی بات نہیں کی تھی اور نہ اُنہوں نے ہی مُجھ سے کُچھ کہا تھا۔ رہی اُوشا تو اُس کا ذہن اِس بارے میں شاید بالکل ہی خالی تھا۔ وہ پشکلاوتی جہاں اُس نے جنم لیا تھا، تباہ و برباد ہو چکا تھا۔ وہ پورس جِس کے محل میں وہ پروان چڑھی تھی، مر چُکا تھا۔ اب اُسے کسی خاص جگہ سے دِل چسپی نہ تھی۔ وہ کہیں بھی جا سکتی تھی۔ لیکن اُس نے خود اِس کا فیصلہ کرنے کے بجائے اپنے آپ کو قسمت پر چھوڑ دیا تھا اور یوں میری طرح وہ بھی اپنے بارے میں تقدیر کے فیصلے کا انتظار کر رہی تھی۔

اور پھر ایک رات چندر گُپت محل کے اُس حصّے کی طرف آیا جہاں ہم ٹھہرے ہوئے تھے۔ اُس وقت وہ کسی پہرے دار کے ساتھ نہیں، اکیلا آیا تھا۔ سارنگ بابا، انوشا اور اُوشا کے پاس آنے کے لیے اُسے کسی حفاظتی بندوبست کی ضرورت نہیں تھی۔

اُس نے آتے ہی سارنگ بابا اور مُجھے جھک کر آداب کیا۔ اُوشا سے بھائی کی طرح

گلے ملا اور پھر مُجھ سے مخاطب ہوا:

"انوشا مہاراج! میں اِس وقت ایک بادشاہ کی حیثیت سے آپ کو سلام کرنے آیا ہوں تو یہ سب آپ کی مہربانی کی بدولت ہے۔ اگر آپ نے مُجھے جہلم کے پار نہ پہنچایا ہوتا تو سکندر کا کوئی ہاتھی مُجھے اپنے پاؤں تلے روند چُکا ہوتا اور پھر کسی کو پتہ بھی نہ چلتا کہ پاٹلی پُتر کے شیش ناگ کا بیٹا پاٹلی پُتر سے بھاگ کر در در کی ٹھوکریں کھاتا، سکندر سے ملنے کے لیے ٹیکسلا آیا تھا۔

اور مہاراج! وہی ٹیکسلا جہاں میں ایک بھکاری کی طرح گیا تھا اور جہاں سے مُجھے اپنی جان بچا کر بھاگنا پڑا تھا، اب میرے استقبال کی تیّاریاں کر رہا ہے۔ مہاراج! کیا آپ میرے ساتھ ٹیکسلا نہیں چلیں گے؟"

اور اِس سے پہلے کہ میں چندر گُپت کی بات کا جواب دیتا، سارنگ بابا نے اُس کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"شیش ناگ کے بیٹے! اطمینان رکھو، ہم تمہارے ساتھ ٹیکسلا چلیں گے۔ ہم

تینوں چلیں گے!"

دریائے جہلم پار کرتے ہی چندر گُپت کا بڑا شاندار خیر مقدم ہوا۔ راجا امبھی نے اِس بات کا خاص طور سے خیال رکھا تھا کہ چندر گُپت کا استقبال، دریائے سندھ کے کنارے سکندر کے استقبال سے زیادہ شان دار ہو۔ چنانچہ چندر گُپت کے استقبال کے لیے سنہری جھولوں والے پچاس ہاتھی آئے تھے، جب کہ سکندر کے استقبال کے لیے تیس ہاتھی بھیجے گئے تھے۔ چندر گُپت کو دریا کے کنارے ایک ہزار سواروں کے دستے نے سلامی دی، جب کہ سکندر کی سلامی کے لیے سات سو سوار بھیجے گئے تھے۔ سکندر کے استقبال کے لیے چاندی کے توڑوں سے لدی ہوئی بیل گاڑیاں بھیجی گئی تھیں۔ چندر گُپت کے استقبال کے لیے آنے والی بیل گاڑیوں میں سونے کے سِکّے لدے ہوئے تھے۔ اِسی طرح ٹیکسلا پہنچنے پر چندر گُپت کا جو استقبال ہوا، وہ دریائے جہلم کے کنارے ہونے والے سکندر کے استقبال سے کئی گُنا شان دار تھا۔ میں یہ استقبال دیکھ رہا تھا اور میرے دِل میں ایک دو نہیں کئی سوال پیدا ہو رہے تھے:

کیا راجا امبھی چندر گُپت کو خوش کرنے کے لیے جشن کا بندوبست کرے گا؟ کیا وہ چندر گُپت کو ایسا تحفہ بھی پیش کرے گا جو سکندر کو دیے ہوئے تحفے یعنی شیش ناگ والے ہیروں سے بڑھ کر ہو؟ یہ تحفہ کیا ہو گا؟ کہاں سے آئے گا؟ کون لائے گا؟ کون پیش کرے گا؟ ابھی میرے پاس اِن سوالوں میں سے کسی کا بھی جواب نہیں تھا۔

ٹیکسلا میں اپنے شان دار استقبال کے بعد چندر گُپت نے دربار لگایا اور ٹیکسلا کے تمام امیروں وزیروں اور درباریوں نے اُس کے سامنے اپنی اطاعت اور وفاداری کا اظہار کیا۔

راجا امبھی چندر گُپت کے پاس بالکل اُسی انداز سے بیٹھا تھا جس طرح وہ پہلے سکندر کے پاس بیٹھا تھا۔ پہلے کی طرح اب بھی راجا امبھی کے قریب میرا وہ سوتیلا بھائی بیٹھا تھا جس کے متعلّق نجومیوں نے بتایا تھا کہ راج محل میں رہنا اور راج پاٹ سنبھالنا اِس لڑکے کی قسمت میں لکھا ہے۔ یہ وہ راج کُمار تھا جس کی

خاطر میرا باپ مُجھے اور میری ماں کو یوں بھول گیا تھا جیسے میری ماں اُس کی زندگی میں کبھی آئی ہی نہ تھی اور جیسے اُس کی بڑی رانی کے ہاں انوشانام کے کسی بیٹے نے جنم ہی نہیں لیا تھا۔

میں نے راجا امبھی کے چہرے سے نظریں ہٹا کر ایک نظر اُس راج کُمار کو دیکھا۔ سکندر کے دربار میں مَیں نے اُسے ایک نظر دیکھا تھا تو مُجھے اُس میں کوئی خاص بات دِکھائی نہ دی تھی، لیکن اب اُس کو ایک نظر دیکھتے ہی میری نگاہیں اُس کے چہرے پر جم گئیں۔

میرے سامنے ایک ایسے نوجوان کا چہرہ تھا جو ایسے سمندر کی طرح پُر سکون نظر آتا تھا جس کی تہہ میں لاکھوں طوفان پل رہے ہوں۔ وہ خاموش تھا۔ راجا امبھی ذرا ذرا دیر بعد مُسکراتے ہوئے اُس کی طرف دیکھتا تھا اور کبھی کبھی آہستہ سے اُس کے کان میں کُچھ کہتا بھی تھا، جس کا جواب وہ ہلکی سی مُسکراہٹ سے دیتا تھا۔

راجا امبھی نے جشن کے لیے پورا پورا انتظام کر رکھا تھا اور اِس بات کا بھی پورا

خیال رکھا تھا کہ یہ جشن سکندر کے لیے نہیں، چندرگُپت کے لیے ہے۔ سکندر تو اِس سر زمین میں اجنبی تھا، اِس لیے ہاتھیوں کا ناچ، بازی گروں کے کرتب، جادُوگروں کے تماشے اور پیروں اور جوگیوں کے شعبدے اُس کے اور اُس کے سپاہیوں کے لیے حیرانی اور دِل چسپی کا باعث ہو سکتے تھے، لیکن چندرگُپت تو اِسی سرزمین کا رہنے والا تھا۔ اُس کے لیے ہاتھیوں کے ناچ، بازی گروں کے کرتب، جادُوگروں کے تماشے اور جوگیوں کے شُعبدے کسی دِل چسپی کا باعث نہ ہو سکتے تھے۔ اِس لیے کہ اُس نے یہ سب کُچھ پہلے ہی دیکھ رکھا تھا۔

اِس کے بجائے راجا امبھی نے ناچنے والوں کی ٹولیاں دُور دُور سے منگوائی تھیں۔ چنانچہ جیسے ہی درباریوں کی طرف سے وفاداری کے اظہار کی کارروائی ختم ہوئی، ناچنے والوں کی ٹولیاں میدان میں آ گئیں اور اپنے اپنے فن کا کمال دِکھانے لگیں۔

یہ کوئی پندرہ کے قریب ٹولیاں تھیں۔ ایک ٹولی کا ناچ ختم ہوتا تو دوسری ٹولی

سامنے آجاتی۔ دوسری ٹولی اپنا ناچ ختم کر چکتی تو تیسری ٹولی میدان میں اُتر آتی۔
چندر گُپت ایک ایک ٹولی کے ناچ کو بڑے غور اور دِل چسپی سے دیکھ رہا تھا۔

جتنی دیر اُن ٹولیوں کا ناچ ہوتا رہا، میرے قریب بیٹھی ہوئی اُوشا بے چینی سے پہلو بدلتی رہی۔ جیسے ہی آخری ٹولی اپنا ناچ ختم کر کے پیچھے ہٹی، اُوشا اُچھل کر چندر گُپت کے سامنے جا کھڑی ہوئی اور بولی:

"شیش ناگ کے بیٹے! اب میں ناچوں گی۔ تمھارے لیے نہیں، اِن کٹھ پُتلیوں کے لیے جِن کا ناچ تُم نے آج دیکھا ہے۔ میں اُنھیں بتانا چاہتی ہوں کہ ناچ کِسے کہتے ہیں۔ یہ وہ تماشا ہے جو سکندر کو بھی دیکھنا نصیب نہ ہو سکا اور وہ اِس کی آرزو دِل میں لیے یہاں سے چلا گیا۔" یہ کہہ کر اُوشا نے میری طرف دیکھا اور بولی۔ "آؤ انوشا!"

میں نے اپنے گلے میں جھُولتے ہوئے شانی کو سارنگ بابا کے حوالے کیا اور خود بین سنبھال کر اُوشا کے پاس آ کھڑا ہوا۔ اُوشا چندر گُپت سے بولی:

”شیش ناگ کے بیٹے! میں پشکلاوتی کے شیش ناگ کے سامنے ناچنا چاہتی تھی، لیکن سکندر نے پشکلاوتی کو تباہ برباد کر دیا۔ تُم پاٹلی پُتر کے شیش ناگ کے بیٹے ہوا اِس لیے میں وہی ناچ ناچوں گی جو پشکلاوتی کے شیش ناگ کے سامنے ناچنا چاہتی تھی۔“

میں اُوشا کے اشارے پر بین پر مہاتالی کی دُھن بجانے لگا۔ اُوشا کا بدن بجلی کی طرح حرکت میں آ گیا اور پھر جو اُس نے ناچنا شروع کیا تو کیا بڑے، کیا چھوٹے سب پر جادُو سا کر دیا۔ جیسے جیسے میری بین کی دُھن تیز ہوتی گئی، اُوشا کے ناچ میں تیزی آتی گئی۔

اُوشا ناچ رہی تھی اور میں بین بجا رہا تھا لیکن بین بجاتے ہوئے میرے ذہن میں راجا پورس کے دربار کا منظر گھوم رہا تھا۔ پورس کے دربار میں، اُوشا کے ناچ کے دوران میں، اُوشا کے پالتو سانپ امبر نے راجا پورس کے بڑے بیٹے کو ڈس لیا تھا اور پھر اُوشا خود پُراسرار طور پر دربار سے غائب ہو گئی تھی۔ میں سوچ رہا تھا کہ

کہیں یہاں بھی کوئی ایسا ہی ماجرا پیش نہ آجائے۔ شاید اُوشا بھی یہی کُچھ سوچ رہی تھی!

رات آدھی سے زیادہ بیت چُکی تھی۔ اتنی دیر تک بین بجاتے رہنے کے باوجود میں اپنے آپ کو تازہ دم محسوس کر رہا تھا اور پورے جوش سے بین بجائے جا رہا تھا۔ اُوشا بھی یوں جوش سے ناچ رہی تھی جیسے وہ تھکاوٹ نام کی کسی چیز کو جانتی ہی نہیں۔

پھر یکایک اُس نے مُجھے اشارہ کیا اور ناچ بند کر دیا۔ میں نے بین ہونٹوں سے ہٹائی اور اُوشا کی طرف دیکھا۔ تمام اہلِ دربار بھی چونک کر اُوشا کی طرف دیکھ رہے تھے۔ لیکن اُوشا چندر گُپت کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اُس نے چندر گُپت سے مخاطب ہو کر کہا۔

''شیش ناگ کے بیٹے! میں چاہوں تو صُبح تک اِسی طرح ناچتی رہوں۔ اِن کٹھ پُتلیوں میں سے کون ایسی کٹھ پُتلی ہے جو میرے مُقابلے میں آنے کا حوصلہ کر

سکے۔ لیکن میں نے اپنا ناچ بند کر دیا تو صرف اِس لیے کہ میں نہیں چاہتی کہ مہا راجا پورس کے دربار کی داستان یہاں بھی دہرائی جائے۔"

یہ کہتے ہوئے وہ میرا ہاتھ تھام کر تیزی کے ساتھ واپس اپنی جگہ پر آ بیٹھی۔ درباریوں کو یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ ایک سُندر سپنا دیکھ رہے تھے اور یہ سپنا یکا یک ٹوٹ گیا ہے۔ چندر گُپت کی بھی یہی کیفیّت تھی۔ اُسے اِس سے پہلے اُوشا کا کمال دیکھنے کا موقع نہیں ملا تھا۔

راجا امبھی کی پُرانی مُشکل

ہم محل کے اس کمرے میں واپس آئے جو ہمارے لیے مخصوص کیا گیا تھا۔ یہ کمرا وہی تھا جس میں سکندر نے ہمیں ٹھہرایا تھا اور یہ وہی کمرا تھا جو کبھی میری ماں کا کمرا تھا۔ اِس کمرے میں انوشا نے جنم لیا تھا۔

ہم ابھی سونے کی تیّاری کر رہے تھے کہ راجا امبھی خود وہاں چلا آیا۔ اتّفاق کی بات کہ پہلے کی طرح اُس وقت بھی سارنگ بابا فرش پر پاؤں پسارے، ایک ستون سے ٹیک لگائے بیٹھے تھے۔ میں شانی کو اور اُوشا اپنے پالتو سانپ امبر کو

دودھ پلا رہی تھی۔

راجا امبھی دروازے میں کھڑا ہو گیا۔ پھر دونوں ہاتھ جوڑ کر سارنگ بابا سے کہنے لگا۔ ”سارنگ مہاراج! میں ایک بار پھر آپ کو تکلیف دینے آیا ہوں۔“

سارنگ بابا نے نہایت بے نیازی کے ساتھ میری طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”ہمارے بیٹے سے بات کرو۔“ امبھی دو قدم آگے بڑھ کر میرے سامنے آ کھڑا ہوا اور اُسی طرح ہاتھ باندھے ہوئے کہنے لگا۔ ”انوشا مہاراج! میں ایک بار پھر آپ کو تکلیف دینے آیا ہوں۔“

پہلے کی طرح اِس بار بھی میرے بدن میں سنسنی دوڑ گئی۔ میرے سامنے میرا باپ کھڑا تھا۔ وہ باپ جو مُجھے اور میری ماں کو یوں بھُول گیا تھا جیسے میری ماں اُس کی زندگی میں کبھی آئی ہی نہیں تھی اور جیسے اُس کی بڑی رانی نے انوشا نام کے کسی بیٹے کو جنم ہی نہیں دیا تھا۔ میرا وہی باپ ایک بار پھر ہاتھ باندھنے میرے سامنے کھڑا تھا اور ایک بار پھر مُجھے بیٹا نہیں، مہاراج کہہ کر مخاطب کر رہا تھا۔ پہلے کی

طرح پھر میرے ذہن میں نجومیوں کی پیش گوئی کے الفاظ گُونجنے لگے۔

"مبارک ہو مہاراج! راج کُمار قسمت کے بڑے ہی دھنی ہیں۔ بڑے بڑے راجا اُن کے آگے سر جھکائیں گے۔ بڑے بڑے بلوان اُن کے سامنے کان پکڑیں گے اور ماتھا رگڑیں گے۔"

ایسے ہی دِن کے بارے میں نجومیوں نے پیش گوئی کی تھی۔ راجا امبھی کو نجومیوں کی پیش گوئی کا پورا پورا یقین تھا، جبھی تو اُس نے ماں بیٹے کو محل میں واپس بلانے سے اِنکار کر دیا تھا کہ نجومیوں کے کہنے کے مطابق راج پاٹ سنبھالنا اُس راج کمار کی قسمت میں نہ تھا۔ لیکن یہ بات امبھی کے وہم و گمان میں بھی نہ تھی کہ اُس راج کمار کے آگے سر جھکانے والے بڑے بڑے راجاؤں میں وہ خود بھی شامل ہو گا۔

"انوشا مہاراج! میں ایک بار پھر آپ کو تکلیف دینے آیا ہوں۔" راجا امبھی نے دوبارہ کہا اور میں چونک گیا۔ میں نے خالی پیالہ ایک طرف کر کے بَل کھاتے

ہوئے شانی کو اپنے ہاتھ میں تھام لیا اور اُٹھ کھڑا ہوا۔

اب میں راجا امبھی کے عین سامنے کھڑا تھا اور میری نظریں اُس کے چہرے پر تھیں۔ میرے ذہن کے پردے پر ایک بار پھر اپنی ماں کی تصویر اُبھری اور میرے دِل و دماغ میں لاوا سا پکنے لگا۔

لیکن ابھی یہ لاوا الفاظ کی شکل میں میری زبان تک نہ آنے پایا تھا کہ مُجھے ایک آواز سُنائی دی۔

"انوشا! ہوش میں آؤ انوشا! تم اپنے باپ کے سامنے کھڑے ہو!"

یہ میری ماں کی آواز تھی۔ میں یوں چونکا جیسے ایک گہرے خواب سے جاگا ہوں۔ شاید پہلے کی طرح اب بھی میری ماں کی بے چین روح میرے ساتھ تھی۔ پہلے ہی کی طرح اس نے مُجھے ٹوکا اور ڈانٹا تھا۔

میرے دماغ کا سارا کھولتا ہوا لاوا ایک دم ٹھنڈا ہو گیا۔ میں نے جھُک کر راجا

امبھی کو آداب کیا اور کہا:

"میں آپ کا بیٹا ہوں، مہاراج! فرمایئے کیا حکم ہے؟"

راجا امبھی ذرا دیر خاموش رہا۔ پھر کہنے لگا، "مہاراج! سکندر یہاں آیا تھا تو اُس وقت بھی میں یہاں ایک سوالی بن کر آیا تھا، اور اب چندر گُپت مہاراج یہاں آئے ہیں تو میں ایک بار پھر آپ کے سامنے سوالی بن کے آیا ہوں۔۔۔۔۔"

"چندر گُپت مہاراج چندر گُپت مہاراج!"

راجا امبھی کی زبان سے چندر گُپت مہاراج کے الفاظ سُن کر میرا ذہن ایک دم پیچھے چلا گیا۔ چندر گُپت سارنگ بابا کے سامنے کھڑا اپنا حال بیان کر رہا ہے۔ چندر گُپت کی سکندر سے ملاقات ہوتی ہے۔ چندر گُپت سکندر سے امداد کی درخواست کرتا ہے۔ اور پھر چندر گُپت کو اپنی جان بچا کر بھاگنا پڑتا ہے۔ اُس وقت تو راجا امبھی یہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ ایک روز یہی بے سر و سامان چندر گُپت اِس حال میں ٹیکسلا آئے گا کہ اُسے اُس کا استقبال سکندر سے کہیں بڑھ کے کرنا

پڑے گا اور اُسے چندر گُپت نہیں، چندر گُپت مہاراج کہنا پڑے گا!

"مہاراج!" راجا امبھی نے کہا اور میں اپنے خیالات سے چونک گیا۔ "مہاراج! آپ نے اُس وقت میری امداد کی تھی اور آج ایک بار پھر میں آپ کی مدد چاہتا ہوں۔ آپ نے اُس وقت سُرخ ہیروں کا تحفہ شیش ناگ کی طرف سے سکندر کو پیش کیا تھا اور اِس طرح سکندر کے سامنے میری عزّت رہ گئی تھی۔ وہ تُحفہ اپنی جگہ بے مثال تھا۔ اُس نایاب اور بے مثال تُحفے کی طرح میں چندر گُپت مہاراج کو بھی کوئی تحفہ دینا چاہتا ہوں۔ ایسا تحفہ جو نایاب اور بے مثال بھی ہو اور ساتھ ہی سکندر کو دیے ہوئے تحفے سے بڑھ کر بھی۔"

راجا امبھی کی یہ بات سُن کر میں نے کہا۔ "مہاراج، سُرخ ہیروں کا وہ تحفہ تو ایسا تھا جو دیوتاؤں کی طرف سے ہی دیا جا سکتا تھا۔ آپ جانتے ہی ہیں کہ وہ ہیرے کسی کان سے نہیں نکلے تھے۔ اُن ہیروں کو تو قدرت نے آدمی کے گوشت، خُون، ہڈّیوں اور مٹّی سے بنایا تھا اور ظاہر ہے ایسے ہیرے قدرت روز روز نہیں

بناتی۔"

"کُچھ بھی کریں، مہاراج۔" راجا امبھی نے کہا۔ "میری عزّت آپ کے ہاتھ ہے، پہلے کی طرح اب بھی آپ ہی میری مُشکل آسان کر سکتے ہیں۔"

میں ابھی سوچ ہی رہا تھا کہ راجا امبھی کی اِس بات کا کیا جواب دوں کہ میرے کان میں ایک آواز آئی:

"آپ اس کی فکر نہ کریں، انوشا مہاراج۔"

میں نے چونک کہ ارد گرد دیکھا۔ یہ نہ اُوشا کی آواز تھی اور نہ سارنگ بابا کی، اور نہ شانی کی۔ یہ راجا امبھی کے بیٹے کی آواز تھی۔ نہ جانے وہ کب سے وہاں موجود تھا۔ اُس نے آگے بڑھ کر مُجھے سلام کیا اور کہنے لگا۔

"آپ اِس کی فکر نہ کریں۔ میں خود اِس کا بندوبست کر لُوں گ۔"

اپنے بیٹے کی آواز سُن کر راجا امبھی ایک دم چونکا اور اُس نے مُڑ کر اُس کی طرف

دیکھا پھر کسی قدر غصّے سے کہنے لگا۔ ”تُم! تُم کب آئے یہاں؟“

”ابھی آیا ہوں، مہاراج!“ راجا امبھی کے بیٹے نے کہا۔ ”اور آپ ہی کی طرف آیا تھا، صرف یہ عرض کرنے کے لیے کہ سارنگ بابا اور انوشا مہاراج کو بار بار تکلیف دینا مناسب نہیں۔ آپ اِس بارے میں بالکل بے فکر رہیے، اور ساری بات مُجھ پر چھوڑ دیجیے۔ میں چندرگُپت کے لیے تحفے کا بندوبست خود کر لوں گا۔ اور یہ تحفہ سکندر والے تحفے سے بڑھ کر ہو گا؟“

”کیا ہو گا؟“ راجا امبھی نے بے تاب ہو کر پوچھا۔

”یہ تو میں ابھی نہیں بتا سکتا۔“ راجا امبھی کے بیٹے نے کہا۔ ”ہاں، اتنا ضرور کہہ سکتا ہوں کہ چندرگُپت اِس تحفے کو بے حد پسند کریں گے۔“

”اور پیش کون کرے گا یہ تحفہ؟“ راجا امبھی نے پوچھا۔

”یہ تکلیف تو اُوشا کو ہی کرنی ہو گی۔ سکندر کی خدمت میں بھی شیش ناگ کے

ہیروں کا تحفہ اُوشا نے ہی پیش کیا تھا اور چندر گُپت کی خدمت میں بھی اُوشا ہی یہ پیش کرے گی۔ میرا خیال ہے، اوشا کو کوئی اعتراض۔ نہ ہو گا۔ کیوں اُوشارانی؟"

"مُجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔" اُوشا نے اپنے پالتو سانپ امبر سے کھیلتے ہوئے جواب دیا۔

"تو بس ٹھیک ہے۔" راجا امبھی کے بیٹے نے مُسکراتے ہوئے کہا اور پھر راجا امبھی سے بولا۔ "آیئے، چلیں۔" یہ کہتے ہوئے وہ جیسے زبردستی راجا امبھی کو وہاں سے کھینچ لے گیا۔ راجا امبھی اور اُس کے بیٹے کے جانے کے بعد میں خاصی دیر تک حیران سا کھڑا رہا۔ کبھی سارنگ بابا کی طرف دیکھتا اور کبھی اُوشا کی طرف۔ لیکن اُن کا دھیان میری طرف تھا ہی نہیں۔ سارنگ، بابا اُسی طرح فرش پر پاؤں پسارے ستون سے ٹیک لگائے بیٹھے تھے۔ اُنہوں نے میری اور راجا امبھی کی بات چیت میں دخل نہیں دیا تھا۔ شاید اِس لیے کہ اب کے یہ فرض سارنگ بابا کے بجائے خود راجا امبھی کے بیٹے نے ادا کر دیا تھا۔ رہی اُوشا تو

وہ پہلے کی طرح اپنے پالتو سانپ امبر کو دودھ پلا چُکنے کے بعد اُس سے کھیل رہی تھی اور راجا امبھی بیٹے کی بات کا مختصر جواب دینے کے بعد پھر امبر سے کھیلنے لگی تھی۔

میں سارنگ بابا اور اُوشا کی طرف دیکھ رہا تھا، لیکن میرے ذہن کے پردے پر راجا امبھی کے بیٹے کی تصویر اُبھر رہی تھی۔ دربار میں مُجھے اُس کا چہرہ ایک ایسے سمندر کی طرح پُر سکون نظر آرہا تھا جس کی تہہ میں لاکھوں طوفان پل رہے ہوں، اور یہاں مُجھے اُس کی مُسکراہٹ ایک ایسا نقاب محسوس ہوئی تھی جس کے پیچھے اُس نے اپنے ذہن کے اصل جذبات کو چھپا رکھا ہو۔

کیسی عجیب بات تھی باپ بیٹا دونوں آپس میں باتیں کرتے رہے تھے، لیکن نہ باپ نے بیٹے کو بیٹا کہا تھا، اور نہ بیٹے نے باپ کو باپ کہہ کر پکارا تھا۔

کہنے کو تو میں بھی راجا امبھی کا بیٹا تھا، لیکن نہ میں نے اُسے باپ کہہ کر بلایا تھا اور نہ اُس نے مُجھے بیٹا کہہ کر پکارا تھا۔ مگر راج کُمار کی بات اور تھی۔ یہ راجا امبھی کا وہ

بیٹا تھا جس کے متعلّق نجومیوں نے بتایا تھا کہ راج محل میں رہنا اور راج پاٹ سنبھالنا اُس کی قسمت میں لکھا ہے۔ اور اِسی کی خاطر میرا باپ مُجھے اور میری اماں کو بھُول گیا تھا۔ پھر کیا بات ہے کہ بیٹے نے باپ کو باپ کہہ کر مخاطب نہیں کیا اور باپ نے بیٹے کو بیٹا کہہ کر نہیں پکارا؟ میں نے بہت سوچا لیکن مُجھے اِس سوال کا جواب نہیں ملا۔

خوف ناک تُحفہ

اپنے سوال کا جواب مُجھے چند روز بعد ملا اور یہ جواب ایسا عجیب و غریب، ایسا خوف ناک تھا کہ میں اِس کا تصوّر بھی نہیں کر سکتا تھا۔

جشن کے فوراً بعد چندر گُپت ٹیکسلا سے واپس جانا چاہتا تھا۔ کیوں کہ اُسے مگدھ کی ریاست کے خلاف جنگی تیّاریاں کرنا تھیں۔ پاٹلی پُتر کا کھویا ہوا راج حاصل کرنا شیش ناگ کے اِس بیٹے کا پہلے دِن سے ہی مقصد تھا۔ اب کہ دریائے بیاس تک اور شمال کے پہاڑوں سے جنوب کے سمندر تک یونانیوں کے تمام ٹھکانے ختم ہو

چکے تھے اور سکندر کے فتح کیے ہوئے تمام علاقے اسے اپنا بادشاہ تسلیم کر چُکے تھے، تو اِس مہم کے لیے میدان کافی ہموار ہو گیا تھا۔ خود مگدھ کی ریاست کے حالات ایسے تھے کہ چندر گُپت اُن سے فائدہ اُٹھا سکتا تھا۔ اب وہ مگدھ پر چڑھائی کی مہم کو اور زیادہ ملتوی کرنا نہیں چاہتا تھا۔ مگر آدمی سوچتا کُچھ ہے اور ہوتا کُچھ اور ہے!

چند روز بعد ہی ناگ پنچمی کا تہوار آ رہا تھا۔ یہ وہ تہوار تھا جسے شمال سے لے کر جنوب تک اور پُورب سے لے کر پچھّم تک ناگ دیوتا کے پُجاری ہر سال بر دھوم دھام سے مناتے تھے۔ یہ سمجھا جاتا تھا کہ اِس پر جو شخص جتنے زیادہ سانپوں کو دُودھ پلائے گا اُتنا اُس کا اگلا سال اچھّا گُزرے گا۔ اور چندر گُپت تو خود شیش ناگ کا بیٹا تھا۔ تہوار کے موقع پر خود اُس کے موجود ہونے سے زیادہ خوش قسمتی کی بات اور کیا ہو سکتی تھی!

راجا امبھی اور اُس کے درباری نہیں چاہتے تھے کہ چندر گُپت ناگ پنچمی کے

تہوار سے پہلے واپس چلا جائے۔ اُن کے اصرار پر چندر گُپت کُچھ دِن اور ٹیکسلا میں ٹھہرنے پر راضی ہو گیا۔

راجا امبھی اور اُس کے درباریوں کے علاوہ چندر گُپت کے وزیر چانکیہ نے بھی اُسے یہی مشورہ دیا تھا کہ وہ ناگ پنچمی کے تہوار تک ٹیکسلا ہی میں ٹھہرے اور یہ تہوار ٹیکسلا ہی میں منائے۔ تہوار کی تیّاریوں میں راجا امبھی اور اُس کا بیٹا دونوں بڑھ چڑھ کر حصّہ لے رہے تھے۔ لیکن باپ کے مُقابلے میں بیٹے کی تیّاریوں کا پلڑا بھاری تھا۔

ناگ پنچمی کا دِن آ پہنچا۔ تکشک مندر کے اندر اور اُس کے سامنے میدان میں دودھ کی کٹوریاں یوں نظر آتی تھیں جیسے کِسی جھیل کی سطح پر کنول کے سفید پھول۔ لوگ آتے اور تکشک مندر میں تہوار کی رسمیں ادا کرنے کے بعد کٹوریوں میں دودھ ڈالتے جاتے۔ اِدھر اُدھر سے سانپ آ کر اِن کٹوریوں سے دودھ پی رہے تھے۔

چندر گُپت راجا امبھی اور اُس کے درباریوں کے ساتھ مندر میں آیا اور تمام رسمیں ادا کرنے کے بعد اُس اُونچے تخت پر جا بیٹھا جو اُس میدان میں اُس کے لیے رکھا گیا تھا۔ یہ تخت عین اُسی جگہ تھا جہاں سے سکندر نے اپنے سپاہیوں کے کھیل تماشوں اور اُن کے بعد راجا امبھی کے جشن کا نظّارہ کیا تھا۔ میں، سانگ بابا اور اُوشا ساتھ ہی آئے تھے۔ ہم مندر سے باہر نکلے تو سارنگ بابا اور اُوشا تو چندر گُپت کے ساتھ ہی تخت کی طرف بڑھ گئے، لیکن میں مندر کی دیوار سے ٹیک لگا کر اُن سانپوں کو دیکھنے لگا جو کٹوریوں سے دودھ پی رہے تھے۔

پھر جیسے مُجھ سے رہا نہ گیا۔ میں نے بین سنبھال لی۔ بین ہونٹوں سے لگاتے ہی میں ایک بار پھر وہی انوشا بن گیا جو پشکلاوتی کے شیش ناگ کے مندر میں ناگ پنچمی کے تہوار پر سانپوں کو جمع کرنے کے لیے بین بجایا کرتا تھا۔

مُجھے بین بجاتے تھوڑی دیر ہی ہوئی تھی کہ تکشک مند کے سامنے میدان میں سانپوں کا میلا سا لگ گیا۔ رنگ رنگ کے سینکڑوں نہیں ہزاروں سانپ میدان

میں آ جمع ہوئے تھے اور کٹوریوں سے دودھ پی رہے تھے۔

میں تکشک مندر کی دیوار سے ٹیک لگائے بین بجا رہا تھا۔ لیکن کئی بار میں نے محسوس کیا جیسے میں پشکلاوتی میں شیش ناگ کے مندر میں ہوں۔ کئی بار مُجھے یوں لگا جیسے میں پروریور کے پاس تکشک ناگ کے مندر میں ہوں۔پشکلاوتی میں شیش ناگ کے مندر میں میری بین کی آواز پر جو سانپ جمع ہوئے تھے، اب میں اُنہیں اپنے سامنے تکشک مندر کے میدان میں کٹوریوں سے دودھ پیتے دیکھ رہا تھا۔

شام تک یہ سِلسِلہ جاری رہا۔ میں بین بجاتا رہا سانپ آتے رہے۔ سانپ آتے رہے اور کٹوریوں سے دودھ پیتے رہے۔ کٹوریاں خالی ہوتی رہیں اور لوگ انہیں دوبارہ دُودھ سے بھرتے رہے۔ ہر گوری خالی ہوتے ہی فوراً بھر دی جاتی تھی۔

کہنے کو ناگ پنچمی کا تہوار ٹیکسلا میں ہر سال منایا جاتا تھا، لیکن اِتنی زیادہ تعداد میں سانپ اِس سے پہلے کبھی جمع نہیں ہوئے تھے۔ اِس بات سے لوگوں میں ایک غیر معمولی جوش پیدا ہو گیا تھا اور شاید وہ اِس سے یہ شگون لے رہے تھے

کہ جلد ہی کوئی بہت ہی انوکھا واقعہ ہونے والا ہے۔

شام ہوئی تو میں نے بین ہونٹوں سے ہٹائی۔ سانپ دودھ پینے کے بعد رینگتے ہوئے واپس جانے لگے۔ میں تھوڑی دیر تک اُن کی طرف دیکھتا رہا اور پھر جو اپنے دائیں طرف نگاہ کی تو قریب ہی چندر گُپت کو کھڑا پایا۔ میں نے حیرت سے کہا۔

"شیش ناگ کا بیٹا، یہاں کیا کر رہا ہے؟ اُسے تو اپنے تخت پر ہونا چاہیے تھا۔"

چندر گپت فوراً بول اُٹھا۔ "شکر ہے کہ آپ نے میری طرف ایک نظر تو کی۔ میں تو صرف آپ کی ایک نظر کی خاطر صُبح سے آپ کے پاس آ کھڑا ہوا تھا۔ پھر آپ تو ناگوں کی دُنیا میں یوں کھوئے ہوئے تھے کہ یوں لگتا تھا کہ آپ میری طرف اُس وقت دیکھیں گے جب میں خود ناگ کے روپ میں آپ کے سامنے آؤں گا۔"

میں نے چندر گُپت کی طرف غور سے دیکھا۔ اِس وقت مُجھے معلوم ہوا کہ جب

میں نے بین بجانی شروع کی تھی تو اُس کے ذرا دیر بعد ہی چندر گُپت اپنے تخت سے اُٹھ کر میرے پاس آ کھڑا ہوا تھا۔ اتنی تعداد میں سانپ اُس نے پہلے کبھی نہیں دیکھے تھے۔ اِسی لیے بادشاہ ہونے کے باوجود، وہ بچّوں کی سی دلچسپی اور حیرانی سے اِن سانپوں کو دیکھتا رہا تھا۔

"تم تو خود شیش ناگ کے بیٹے ہو، چندر گُپت۔" میں نے کہا۔ "تمھیں ناگ کے روپ میں آنے کی کیا ضرورت ہے؟"

"میں صرف آپ کی توجّہ چاہتا ہوں مہاراج۔" چندر گُپت نے کہا۔ "یہی وہ شہر ہے جہاں میں سکندر کے سامنے ایک بھکاری اور سوالی بن کر پیش ہوا تھا اور یہیں سے آپ نے مُجھے اُٹھا کر جہلم کے پار پہنچایا تھا۔"

"تو کیا اب پھر اُسی طرح جہلم کے پار جانا چاہتے ہو؟" میں نے پوچھا۔ "اب میں جہلم نہیں، ستلج کے پار جانا چاہتا ہوں۔ مگدھ کی راجدھانی میرے سپنوں میں بسی ہوئی ہے۔ پاٹلی پُتر کی یاد شیش ناگ کے بیٹے کو ایک پل کے لیے چین نہیں لینے

دیتی۔“

”شیش ناگ کے بیٹے کو تھوڑا صبر سے کام لینا چاہیے۔ ہر کام کا ایک وقت ہوتا ہے۔ جب وقت آئے گا تو قدرت خود تمہارے گھوڑے کی باگیں تھام کر تمہیں پاٹلی پُتر کی طرف لے جائے گی۔ ابھی تو یہاں کئی باتیں ایسی ہیں جو تمہاری توجّہ چاہتی ہیں، اور جِن کی طرف کبھی تمہارا دھیان بھی نہیں گیا ہو گا۔“

یہ الفاظ میرے مُنہ سے ضرور نکلے تھے، لیکن مُجھے خود پتا نہ تھا کہ میں کیا کہہ رہا ہوں۔ مُجھے بالکل معلوم نہ تھا کہ وہ کیا باتیں ہیں جو چندر گُپت کی توجّہ چاہتی ہیں۔ یوں معلوم ہو رہا تھا جیسے میری زبان سے یہ الفاظ کسی اَن دیکھی طاقت نے کہلوائے ہیں۔

”اپنے تخت پر جا کر بیٹھو شیش ناگ کے بیٹے۔ شام ہو چُکی ہے۔ سب سانپ دودھ پی کر واپس جا چکے ہیں۔“

سانپوں کے ذکر سے چندر گُپت حیرت سے بچّوں کی طرح اُچھل پڑا۔

”اتنے سانپ! میں نے اتنے سانپ آج تک نہیں دیکھے۔ مُجھے یقین نہیں آتا کہ یہ سب سانپ یہیں کے تھے۔ مُجھے تو یوں لگتا تھا جیسے ہندوستان بھر کے سانپ یہاں آجمع ہوئے تھے۔ کیوں میں ٹھیک کہہ رہا ہوں نا؟“

”ہاں!“ میں نے جواب دیا۔ ”یہ سانپ صرف ٹیکسلا اور اُس کے آس پاس کے علاقوں کے نہیں تھے۔ اِن میں بہت سے ایسے سانپ تھے جو دُور دُور سے آئے تھے۔پشکلاوتی سے۔ پرورپور سے اور نہ جانے کہاں کہاں سے۔“

یہ سُن کر چندر گُپت نے حیرت سے میری طرف دیکھا اور پھر بولا۔ ”تو اِس کا مطلب یہ ہوا کہ آپ نے اپنی بین کے زور سے کوسوں دور سے سانپوں کو یہاں جمع کر لیا تھا۔ پھر تو شاید اِن میں کوئی سانپ پاٹلی پُتر سے بھی آیا ہو گا؟“

”شاید آیا ہو۔“ میں نے جواب دیا۔ ”تُم پہلے یہ بات کہتے تو ہم اِن سانپوں سے اُس وقت پوچھ ہی لیتے جب وہ دودھ پی رہے تھے اور اگر کوئی سانپ پاٹلی پُتر سے آیا ہوتا تو اُس سے تمہاری ملاقات کرا دیتے۔“

”میں یہ بات کب کہتا اور کس طرح کہتا۔ میں تو سارا دِن یہاں آپ کے پاس یہ آس لگائے کھڑا رہا کہ کب آپ میری طرف دیکھیں اور میں کُچھ کہوں۔“

”ہر کام کی طرح ہر بات کا بھی ایک وقت ہوتا ہے۔“ میں نے کہا۔ ”شیش ناگ کے بیٹے کو تھوڑا صبر کرنا چاہیئے۔ اب وہ سکندر کے دربار میں پیش ہونے والا سوالی نہیں، راجاؤں کا راجا ہے۔“

”مہاراج!“ چندر گُپت نے میرے دونوں ہاتھ تھام کر کہا۔ ”مُجھے جو کُچھ ملا ہے، آپ کی مہربانی سے ملا ہے، اور جو ملے گا، آپ کی مہربانی سے ملے گا۔“

میں نے نرمی کے ساتھ اپنے ہاتھ چندر گُپت سے چھُڑائے اور سامنے کی طرف نگاہ کی۔ میدان میں بچھے ہوئے اُونچے تخت کے آس پاس مشعلیں روشن ہو چکی تھیں اور اِن مشعلوں کی روشنی میں لوگ تخت کے آس پاس جمع ہو رہے تھے۔ مُجھے صاف محسوس ہو رہا تھا کہ اُن سب کی آنکھیں چندر گُپت کی طرف لگی ہیں۔

”شیش ناگ کے بیٹے!“ میں نے تخت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”اُدھر

دیکھو! وہاں کتنے لوگ تمہاری راہ دیکھ رہے ہیں۔ چلو اُس تخت کو رونق بخشو کہ یہی وہ تخت ہے جو قدرت نے تمہارے لیے بچھایا ہے۔ آؤ!"

یہ کہتے ہوئے میں نے آگے قدم بڑھائے۔ چندر گُپت خاموشی سے میرے ساتھ ہو لیا۔ وہ تخت کے قریب پہنچا تو لوگوں نے اُسے جھک کر سلام کیا اور وہ جیسے اپنے آپ میں آ گیا اور پھر سے راجاؤں کا راجا چندر گُپت بن گیا۔ وہ بڑے وقار سے قدم اُٹھاتا ہوا تخت پر جا بیٹھا اور ایک نظر اُن لوگوں کو دیکھا جو صُبح سے ہی اُس کے انتظار میں ہاتھ باندھے کھڑے تھے۔

یہ سب لوگ راجا امبھی کے درباری تھے۔ اِن میں سارنگ بابا اور اُوشا بھی تھے۔ لیکن وہ خاموشی سے ایک طرف کھڑے تھے۔ چندر گُپت کا وزیر چانکیہ تخت کے پیچھے کھڑا تھا۔ راجا امبھی کے سارے درباری موجود تھے، مگر خود امبھی نہیں آیا تھا۔ اُس کا بیٹا بھی نہیں تھا۔ اور یہ بڑی حیرت کی بات تھی!

لیکن ابھی چندر گُپت اپنی اِس حیرانی کو ظاہر کرنے نہ پایا تھا کہ راجا امبھی کا بیٹا نہ

جانے کِس طرف سے نِکل کر تخت کے پاس آکھڑا ہوا۔ اُس کے ساتھ ایک سپاہی تھا جس نے ایک تھال اُٹھار کھا تھا۔ تھال پر سُرخ رنگ کا بھاری کپڑا پڑا تھا۔

امبھی کے بیٹے نے تین بار جھک کر چندر گُپت کو آداب کیا اور پھر درباریوں سے مخاطب ہو کر کہنے لگا۔

"آپ سب کو یاد ہو گا، سکندر نے یہیں، اِسی تخت پر بیٹھ کر جشن کے کھیل تماشے دیکھے تھے اور یہیں اُوشارانی نے سکندر کی خدمت میں سُرخ ہیروں کا تحفہ پیش کیا تھا۔ لیکن آج سکندر کی ساری بادشاہی چندر گُپت مہاراج کے قدموں تلے ہے۔ وہ لوگ جو کل تک سکندر، کا نام لے کر جیتے تھے آج چندر گُپت کے نام کی مالا جپتے ہیں۔ ہم نے چندر گُپت کا جو استقبال کیا ہے، اُس کے سامنے سکندر کی آؤ بھگت کی کوئی حیثیت نہیں اور آج ہم چندر گُپت کو جو تحفہ پیش کر رہے ہیں، وہ اپنی جگہ نایاب اور بے مثال ہے اور سکندر کو دیے ہوئے تُحفے سے کہیں بڑھ کر ہے۔"

راجا امبھی کا بیٹا یہ سب کُچھ کہہ رہا تھا اور میں سوچ رہا تھا کہ راجا امبھی خود کہاں ہے؟ وہ خود یہاں کیوں نہیں آیا؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ۔۔۔"

میرا دل کئی اَن جانے اندیشوں سے کانپنے لگا۔ اُدھر راجا امبھی کا بیٹا اب چندر گُپت سے مخاطب تھا!

"مہاراج! میں آپ کے قدموں کی دھول بھی نہیں ہوں۔ میری یہ مجال کہاں کہ اپنے ہاتھوں سے یہ تحفہ آپ کی نذر کر سکوں، اِس لیے سارنگ بابا اور انوشا رانی سے درخواست کروں گا کہ وہ اپنے ہاتھوں سے یہ تُحفہ مہاراج کی نذر کریں کہ یہ اُنہی کا حق ہے۔"

راجا امبھی کے بیٹے کی یہ بات سُن کر سارنگ بابا اور اُوشا اُس کے پاس جا کھڑے ہوئے۔ سارنگ بابا نے چندر گُپت سے کہا:

"شیش ناگ کے بیٹے! تو وہ ہے جسے لوگ رہتی دُنیا تک یاد رکھیں گے۔ جب سکندر کا ذکر آئے گا تو دُنیا جہاں مہاراجا پورس اور سانگلا کے کاٹھی راجا کی بہادری

کو یاد کرے گی، وہاں تیری ہمّت اور دلیری کو بھی داد دے گی، اِس لیے کہ تو وہ ہے جس نے سکندر کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کی تھی۔ تُو نے وہ کُچھ کیا ہے جو اِس سے پہلے کسی نے نہیں کیا۔ شیش ناگ کے بیٹے اِسی لیے قُدرت نے تُجھے وہ کُچھ دیا ہے جو تُجھ سے پہلے کسی کو نہیں ملا اور تُجھے وہ کُچھ ملے گا جو تُجھ سے پہلے کسی کو نہیں مِل سکا۔"

یہ کہہ کر سارنگ بابا نے اُوشا کو اشارہ کیا۔ اُوشا نے آگے بڑھ کر تھال سپاہی سے لے لیا اور اُسے چندر گُپت کی طرف بڑھاتے ہوئے بولی!

"شیش ناگ کے بیٹے! یہ لو!"

چندر گُپت اُوشا کو دیکھ کر مُسکرا دیا اور بولا۔ "اوہ! شیش ناگ کی بیٹی ہمارے لیے تُحفہ لائی ہے۔ کیا ہے اِس تھال میں؟"

اُوشا ابھی کُچھ جواب نہ دے پائی تھی کہ راجا امبھی کے بیٹے نے آگے بڑھ کر تھال پر پڑا ہوا سُرخ کپڑا کھینچ لیا۔

تھال میں راجا امبھی کا سر پڑا ہوا تھا!

چندر گُپت ایک دم اُٹھ کھڑا ہوا۔ تھال میں راجا امبھی کا سر دیکھ کر اُوشا کی چیخ نِکل گئی، تھال اُس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا اور راجا امبھی کا سر تھال سے لُڑھک کر چندر گُپت کے قدموں میں جا گرا۔

درباری اِس سر کو یوں دیکھ رہے تھے جیسے اُنہیں اپنی آنکھوں پر یقین نہ آ رہا ہو۔ اور میں راجا امبھی کے بیٹے کی طرف، اپنے سوتیلے بھائی کی طرف، دیکھ رہا تھا۔ وہ نہایت اطمینان سے کھڑا تھا، جیسے بات ہی کوئی نہ تھی۔

اُس سے ہٹ کر میں نے چندر گُپت کے قدموں میں پڑے ہوئے راجا امبھی کے سر کو دیکھا۔ مُجھے اپنے سوال کا جواب مل چکا تھا۔ مُجھے معلوم ہو چُکا تھا کہ اُس روز جب راجا امبھی چندر گُپت کے لیے تحفے کی بات کرنے آیا تھا اور اُس کا بیٹا اُسے واپس لے گیا تھا، تو باپ نے بیٹے کو بیٹا اور بیٹے نے باپ کو باپ کہہ کر کیوں مخاطب نہیں کیا تھا۔ اِس وقت باپ اور بیٹے کے درمیان جو گفتگو ہوئی تھی، اُس

وقت میرے ذہن میں اس کا کوئی خاص مطلب نہیں آیا تھا۔ لیکن اب ہر بات صاف ہو گئی تھی۔ بیٹے نے باپ کو راستے سے ہٹا کر اُس کی جگہ خود لینے کا فیصلہ کر رکھا تھا۔ اُسے صرف موقعے کا انتظار تھا اور وہ چندر گُپت کی آمد نے اُسے مہیّا کر دیا تھا۔

میں نے ایک بار پھر اپنے سوتیلے بھائی کی طرف دیکھا جس نے اپنے باپ کا سر کاٹ کر چندر گُپت کی خدمت میں پیش کیا تھا۔ درباریوں کے چہرے حیرانی اور خوف کی تصویر بنے ہوئے تھے، لیکن خود اُس کے چہرے پر کوئی حیرانی نہ تھی۔ کوئی خوف نہ تھا۔ یہ وہ راج کُمار تھا جس کے بارے میں نجومیوں نے راجا امبھی کو یہ بتایا تھا کہ راج محل میں رہنا اور راج پاٹ سنبھالنا اُس کی قسمت میں لکھا ہے۔ یہ وہ راج کُمار تھا جس کی خاطر راجا امبھی مُجھے اور میری ماں کو بھول گیا تھا۔

نجومیوں کی پیش گوئی اب پوری ہو رہی تھی۔ لیکن نجومیوں نے راجا امبھی کو یہ نہیں بتایا تھا کہ راج پاٹ سنبھالنے کے لیے یہ راج کُمار خود اپنے باپ کو قتل

کرے گا اور یہ سوچتے ہوئے مُجھے راجا امبھی کے وہ الفاظ یاد آئے جو اُس نے اُس رات کہے تھے جب وہ سکندر کے تُحفے کی بات کرنے آیا تھا۔ اُس نے کہا تھا: ”ہم راجاؤں کی اپنی مجبوریاں ہوتی ہیں۔ یہ وہ دُنیا ہے جہاں بھائی بھائی کا بیری ہوتا ہے۔ یہاں اپنی گردن بچانے کے لیے بھائی کا گلا کاٹنا پڑتا ہے۔ یہاں بیٹا باپ کو قتل کر کے اُس کی گدّی سنبھالتا ہے۔“

میں راج کُمار کی طرف دیکھ رہا تھا۔ لیکن نہ جانے کیوں مُجھے اُس سے نفرت محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ میرے دِل میں اِنتقام کی کوئی لہر نہیں اُٹھ رہی تھی۔ شاید اِس لیے کہ میں سمجھتا تھا کہ امبھی ایسے ہی انجام کا حق دار تھا۔ اس کے ساتھ ایسا ہی ہونا چاہیے تھا۔

مُجھے اپنی ماں کی بے کسی اور بے بسی یاد آگئی۔ اُس عورت نے راجا امبھی کے فیصلے کو تقدیر کا فیصلہ سمجھ کر بڑے حوصلے سے قبول کیا تھا اور اپنی زندگی کے آخری سانس تک شکایت کا لفظ بھی زبان پر نہیں لائی تھی۔ بلکہ مرنے کے بعد بھی اُس

کی بے چین روح مجھے اُس وقت ٹوکتی اور ڈانٹتی رہی تھی جب راجا امبھی کو اپنے سامنے دیکھ کر میرے دِل و دماغ میں آگ سی لگ جاتی تھی۔

پھر مجھے اُس تباہی اور بربادی کا خیال آیا جو سکندر اِس مُلک میں اپنی نشانی کے طور پر چھوڑ گیا تھا۔ اُس نے پشکلاوتی اور اُس کے اِرد گرد کے علاقے کو تباہ کر دیا تھا۔ اُس نے اشواکوں کو نہایت بے دردی سے موت کے گھاٹ اتارا تھا۔ اُس نے جہلم کے کنارے پورس کی فوج کو خُون میں نہلا دیا تھا۔ اُس نے سانگلا کے قلعے کی اینٹ سے اینٹ بجادی تھی اور سترہ ہزار کاتھیوں کو موت کی نیند سُلا دیا تھا۔ اُس نے ملّہی، سیوی، یادیو، کشودراک، سمبھا، اگالاس اور کتنے ہی دوسرے قبیلوں کا قتلِ عام کیا تھا۔ اِس ساری تباہی اور بربادی کی ذمّہ داری راجا امبھی پر آتی تھی۔ اُس نے راجا پورس سے بدلہ لینے کی خاطر، اُسے نیچا دِکھانے کی خاطر، سکندر کی اطاعت قبول کی تھی۔ اُس نے سندھ سے جہلم تک کا علاقہ چاندی کی طشتری میں رکھ کر سکندر کو پیش کر دیا تھا۔ وہ اِس مُلک کی سرحدوں کا محافظ تھا، لیکن سرحدوں کی حفاظت کرنے کے بجائے اُس نے سکندر کے لیے اِسی مُلک کے

دروازے کھول دیے تھے۔

میں یہ سوچ رہا تھا اور محسوس کر رہا تھا کہ راجا امبھی ایسے ہی سلوک اور ایسے ہی انجام کا حق دار تھا۔ حیرانی کی بات یہ تھی کہ اپنے باپ کے بارے میں اِن سوچوں پر اب کے میری ماں کی بے چین روح نے مُجھے نہیں ٹوکا۔ شاید اِس لیے کہ راجا امبھی کی رُوح خود اُس کے پاس پہنچ گئی تھی۔ راجا امبھی نے چندر گُپت کو ایک ایسا تُحفہ پیش کرنا چاہا تھا جو سکندر کو دیے ہوئے تُحفے سے بڑھ کر ہو۔ اب راجا امبھی کا سر چندر گُپت کو تُحفے کے طور پر پیش کیا جا چکا تھا اور میں سوچ رہا تھا کہ راجا امبھی اِس سے زیادہ بہتر تُحفہ چندر گُپت کو پیش نہیں کر سکتا تھا۔ راج کُمار نے ٹھیک کہا تھا کہ یہ تُحفہ اپنی جگہ نایاب اور بے مثال بھی ہے اور سکندر کو دیے ہوئے تُحفے سے بڑھ کر بھی ہے۔ میں اِن سوچوں میں کھویا ہوا تھا کہ چندر گُپت کی آواز نے مُجھے چونکا دیا۔ وہ کہہ رہا تھا۔ ”راج کُمار! تم امبھی کے وارث ہو۔ آج سے تُم امبھی ہو!“

میں نے چندر گُپت کی طرف دیکھا۔ وہ ابھی تک کھڑا تھا، لیکن اب اُس کے چہرے پر حیرت نہیں تھی۔ پھر میں نے راج کُمار کی طرف دیکھا۔ اُس کا سر غُرور اور فخر سے اُٹھا ہوا تھا۔ چندر گُپت کی بات سُن کر اُس نے تین بار جھک کر آداب کیا اور اِس کے ساتھ ہی درباریوں نے جھک کر آداب کرتے ہوئے اُسے مبارک باد دینا شروع کر دی۔ حالانکہ راجا امبھی کا سر ابھی تک اُن کی نظروں کے سامنے چندر گُپت کے قدموں میں پڑا تھا۔

پھر میں نے چندر گُپت کے تخت کے پیچھے کھڑے ہوئے چانکیہ کی طرف دیکھا۔ اُس کے چہرے پر ایک عجیب سی مُسکراہٹ تھی، جو صاف صاف کہے دیتی تھی کہ یہ جو کُچھ ہوا ہے، خود اُس کے مشورے اور رضامندی سے ہوا ہے۔ راجا امبھی کے بیٹے میں اتنی ہمّت نہ تھی کہ وہ چانکیہ کی حمایت کے بغیر اپنے باپ کو قتل کر سکتا۔ چانکیہ کی حمایت حاصل ہونے کے بعد ہی اُس نے اپنے باپ کا سر کاٹ کر تُحفے کے طور پر چندر گُپت کو پیش کیا تھا اور چندر گُپت نے باپ کے بعد بیٹے کو ٹیکسلا کی گدّی پر بِٹھا دیا تھا۔

پھر میں نے ایک نظر درباریوں کے چہروں پر ڈالی۔ کسی کو بھی راجا امبھی کے قتل ہونے کا غم نہ تھا۔ اور غم ہوتا بھی کیوں؟ وہ تو چڑھتے سورج کے پُجاری تھے۔ باپ زندہ تھا تو وہ اُس کے وفادار تھے۔ باپ کو قتل کر کے بیٹا گدّی پر بیٹھ گیا تھا تو اُن کی وفاداریاں اُس کے ساتھ ہو گئی تھیں۔

پھر میں نے سارنگ بابا اور اُوشا کی طرف دیکھا۔ اُن کے چہروں پر سنجیدگی تھی۔ جیسے کہہ رہے ہوں "یہ راج پاٹ آنی جانی چیز ہے۔ راجا آتے رہتے ہیں، جاتے رہتے ہیں۔ جوگیوں کو نہ کسی راجا کے جانے کا غم ہوتا ہے اور نہ کسی راجا کے آنے کی خوشی۔ یہ سب قدرت کے کھیل ہیں۔ یُوں ہی ہوتا آیا ہے، یُوں ہی ہوتا رہے گا۔"

راج کُمار نے اپنے باپ کا سر قریب کھڑے ہوئے سپاہی کو تھما دیا۔ یہ وہی سپاہی تھا جو اُس کو تھال میں رکھ کر لایا تھا۔ اُس نے دوبارہ اِس سر کو تھال میں رکھ کر اُس پر وہی سُرخ رنگ کا بھاری کپڑا ڈال دیا جو اُس پر پہلے پڑا ہوا تھا۔

پھر نئے امبھی نے چندر گُپت کی طرف رُخ کیا۔ اُس کے سامنے آکر تین بار جھکتے ہوئے آداب کیا اور کہنے لگا۔ "مہاراج! میرے باپ نے آپ سے ناگ پنچمی کے تہوار تک ٹھہرنے کی درخواست کی تھی۔ اب میری درخواست ہے کہ آپ اُن کی آخری رسمیں ادا ہونے تک یہیں ٹھہر جائیں۔"

اِس سے پہلے کہ چندر گُپت کُچھ جواب دیتا، میں بول اُٹھا۔ "شیش ناگ کا بیٹا یہیں ٹھہرے گا اور تمہارے باپ کی آخری رسمیں ادا ہونے کے بعد ہی ٹیکسلا سے جائے گا۔"

میری یہ بات سُن کے سب درباریوں اور چندر گُپت کے تخت کے پیچھے کھڑے ہوئے چانکیہ نے حیرت سے میری طرف دیکھا۔ چندر گُپت نے کوئی حیرانی ظاہر نہیں کی بلکہ میری بات سُن کر بڑے اطمینان سے اُٹھ کھڑا ہوا اور کہنے لگا۔

"ایسا ہی ہوگا انوشا مہاراج! آپ کی بات میرے لیے حکم کا درجہ رکھتی ہے۔"

نئے امبھی کا انجام

میں اپنے بستر میں رات گئے تک تکیے میں مُنہ چھپائے باپ کے درد ناک انجام کے بارے میں سوچتا رہا اور اِسی طرح سوچتے سوچتے نہ جانے کب نیند کی آغوش میں پہنچ گیا۔

میں شاید تھوڑی ہی دیر سویا ہوں گا کہ ایک خوف ناک چیخ نے مُجھے بیدار کر دیا۔ یہ چیخ میرے سوتیلے بھائی نئے امبھی کی تھی۔ وہ دروازے میں کھڑا تھر تھر کانپ رہا تھا۔

”مہاراج! ہمیں بچائیے، مہاراج!“

میں ایک دم کُود کر بستر سے باہر آ گیا۔ سارنگ بابا فرش پر پاؤں پسارے ستون سے ٹیک لگائے بیٹھے تھے۔ چیخ کی آواز نے اُوشا کو بھی بیدار کر دیا تھا لیکن وہ بستر ہی میں بیٹھی حیرانی سے سارنگ بابا کو مُجھے اور دروازے میں کھڑے امبھی کو دیکھ رہی تھی۔

”مہاراج! سارنگ مہاراج! ہماری مدد کیجیے۔ ہمیں بچائیے۔“ سارنگ بابا نے میری طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”ہمارے بیٹے سے بات کرو۔“ تھر تھر کانپتے ہوئے نئے امبھی نے میرے آگے ہاتھ جوڑ دیے۔ ”انوشا مہاراج! ہمیں بچا لیجیے!“

”اس کے ساتھ چلے جاؤ، انوشا بیٹے!“ سارنگ بابا کی آواز گونجی۔ اور میں اپنے سوتیلے بھائی کو ساتھ لے کر باہر کی طرف بڑھا۔ راستے میں اُس نے خود سے تھر تھر کانپتے ہوئے، ساری داستان سُنائی۔

راجا امبھی کی آخری رسموں کی ادائیگی کے لیے پانچ بڑے بڑے پروہتوں کو بُلایا گیا تھا۔ اُنہوں نے راجا امبھی کی لاش کے پاس بیٹھ کر اپنی مقدس کتابوں کے منتر پڑھنے شروع کیے۔ نیا امبھی اُن پروہتوں سے ذرا ہٹ کر ایک طرف بیٹھا تھا اور پروہتوں کے منتر سُن رہا تھا۔ منتر سُنتے سُنتے یکایک وہ اونگھ گیا، پھر اُس نے جیسے کپڑا اپھاڑے جانے کی آواز سُنی۔ ایک دم اُس نے آنکھیں کھول کر سامنے دیکھا۔ سیاہ رنگ کی ایک بڑی سی بلّی لاش کے پاس سے گُزر کر اندھیرے میں غائب ہو گئی۔ اُس کے ساتھ ہی لاش میں حرکت ہوئی اور لاش کے دونوں ہاتھ قریب بیٹھے ہوئے پروہتوں کی طرف بڑھے۔ یہ خوف ناک منظر دیکھ کر نئے امبھی کی چیخ نکل گئی اور وہ اُٹھ کر باہر کی طرف بھاگا۔

محل کے اُس حصّے میں جہاں راجا امبھی کی لاش پڑی تھی، ایک عجیب اور پُراسرار خاموشی تھی۔ اندر جا کر میں نے حیرانی سے لاش کی طرف دیکھا۔ لاش اپنی جگہ بالکل بے حرکت پڑی تھی۔ ایسے کوئی آثار نہ تھے جس سے یہ ظاہر ہوتا کہ لاش نے حرکت کی تھی اور اُس کے ہاتھ منتر پڑھتے ہوئے پروہتوں کی طرف بڑھے

تھے۔

پھر میں نے ایک ایک کر کے تمام پروہتوں کو دیکھا۔ وہ لاش کے اِرد گرد اوندھے مُنہ پڑے تھے اور اُن میں سے ایک بھی زندہ نہ تھا۔ پانچوں کے پانچوں مر چُکے تھے۔

پروہتوں کی لاشوں کو دیکھ کر اِس بات کا یقین کرنا پڑتا تھا کہ راجا امبھی کی لاش ہی نے اُن کی جان لی ہے۔ میں نے لاش اور مردہ پروہتوں سے نظر ہٹا کر دروازے کی طرف دیکھا، جہاں امبھی کا بیٹا کھڑا تھر تھر کانپ رہا تھا۔ میں نے اُس سے کہا۔

”امبھی کے بیٹے! کیا تیرے باپ کا سر اِسی جگہ تن سے الگ کیا گیا تھا؟“ ”نہیں مہاراج!“ امبھی کے بیٹے نے جواب دیا۔ ”یہ واقعہ دوسری جگہ ہوا تھا۔“

”کہاں؟“

"محل کے پچھواڑے باغ میں، جہاں وہ چاندنی راتوں میں کبھی کبھی سیر کیا کرتے تھے۔ گلاب کے اُس کُنج میں جہاں وہ اُس سیر کے بعد بیٹھ کر ذرا آرام کیا کرتے تھے۔"

"امبھی کے بیٹے! تُو اپنے باپ کو اُسی گلاب کے کُنج میں لے جا۔ اُس کی آخری رسمیں تیری موجودگی میں وہیں ادا ہونی چاہئیں۔ اگر ایسا نہ ہوا تو اُس کی روح تُجھ سے کبھی خوش نہ ہو گی؟"

"مُجھے۔۔۔۔۔ مُجھے ڈر لگتا ہے؟" اُس نے رُک رُک کر کہا۔ مُجھے غصّہ آ گیا۔

میں نے اُسے بہت حوصلہ دِلایا لیکن اُس کا ڈر دُور ہونے کا نام ہی نہ لیتا تھا۔ میں نے اُسے طرح طرح سے تسلّی دی۔ یہاں تک کہا کہ اِس کام میں خُود میں بھی ہاتھ بٹاؤں گا لیکن اِس کے باوجود وہ رات کے اندھیرے میں اپنے باپ کی لاش کو ہاتھ لگانا تو کیا، اُس کے پاس بھی آنا نہیں چاہتا تھا۔ اِسی تکرار میں صُبح ہو گئی۔ رات کے اندھیرے کی وجہ سے اُس کے دِل پر جو خوف چھایا ہوا تھا، وہ صُبح کے اُجالے

سے کسی قدر دور ہو گیا اور اُس نے اپنے باپ کی لاش کو محل کے پچھواڑے باغ میں گلاب کے کُنج میں پہنچا دیا۔ اِس کے بعد وہاں پانچ اور نئے پروہت بُلوائے گئے اور اُنہوں نے گلاب کے کُنج میں راجا امبھی کی لاش کے پاس بیٹھ کر منتر پڑھنے شروع کیے۔ سپاہیوں کا ایک دستہ بھی حفاظت کے لیے لاش کے قریب کھڑا کر دیا گیا۔ میں یہ انتظام کروا کر واپس آ گیا۔

اور اگلی صُبح دیکھنے والوں نے دیکھا کہ تمام سپاہی بے ہوش پڑے تھے اور پانچوں کے پانچوں پروہت مر چُکے تھے۔ اُن کے پاس ہی نیا امبھی زمین پر پڑا تڑپ رہا تھا۔ میں فوراً جھک کر اُسے دیکھنے لگا۔ سارنگ بابا اور اُوشا بھی دوڑ کر آئے مگر اِس سے پہلے کہ کوئی کُچھ کہہ سکتا، امبھی کا بیٹا تڑپ تڑپ کر ٹھنڈا ہو گیا۔ اُس کے ساتھ ہی مُجھے اپنے قدموں کے قریب سانپ کے پھُنکارنے کی آواز سُنائی دی۔ میں چونک سا گیا اِس لیے کہ یہ پھُنکار شانی کی پھُنکار جیسی تھی۔ میں نے حیرانی سے اِدھر اُدھر دیکھا اور یہ دیکھ کر میری حیرت کی کوئی حد نہ رہی کہ شانی امبھی کے بیٹے کے پیروں کے پاس موجود ہے۔ پھر شانی نے ایک اور پھُنکار ماری اور

امبھی کے بیٹے کی لاش سوکھی ہوئی لکڑی کی طرح جلنے لگی!

ہم یہ دیکھ کر پیچھے ہٹ گئے اور ذرا دیر بعد ہی امبھی کے بیٹے کی لاش جل کر راکھ ہو گئی۔

لوگ پہلے ہی کُچھ کم حیران نہ تھے۔ اِس پر امبھی کے بیٹے کے ساتھ جو کُچھ ہوا اور جتنی تیزی سے ہوا، اُس سے اُن کے رہے سہے اوسان بھی جاتے رہے۔ اُن میں سے کئی لوگ بے ہوش ہو گئے اور کئی چیخیں مارتے ہوئے بھاگ نکلے۔

راجا امبھی کے بیٹے کے اِس انجام پہ خود میں بھی کُچھ کم حیران نہ تھا۔ بیٹا باپ کو قتل کر کے اُس کی گدّی پر بیٹھ تو گیا تھا لیکن باپ نے دوسرے ہی دِن اُسے اپنے پاس بُلا لیا تھا۔

مُجھے رہ رہ کر نجومیوں کی وہ پیش گوئیاں یاد آ رہی تھیں جو اُنہوں نے میرے اور میرے سوتیلے بھائی کے بارے میں کی تھیں۔ راجا امبھی میری ماں کو اور مُجھے یوں بھُول گیا تھا جیسے میری ماں اُس کی زندگی میں کبھی آئی ہی نہیں تھی اور جیسے

اُس کی بڑی رانی نے انوشا نام کے کسی بیٹے کو جنم ہی نہیں دیا تھا۔ صرف اس وجہ سے کہ نجومیوں کے کہنے کے مطابق راج پاٹ سنبھالنا انوشا کی قسمت میں نہ تھا۔ اور میرے سوتیلے بھائی نے راج محل میں اِس لیے پرورش پائی تھی کہ نجومیوں کے کہنے کے مطابق راج پاٹ سنبھالنا اُس کی قسمت میں لکھا تھا۔ لیکن ان نجومیوں نے راجا امبھی کو یہ نہیں بتایا تھا کہ راج کُمار اپنے باپ کو قتل کر کے راج پاٹ سنبھالے گا اور صرف ایک دِن راج گدّی پر بیٹھ کر دوسرے دِن اپنے باپ کے پاس پہنچ جائے گا!

میں ان سوچوں میں کھویا ہوا تھا کہ سارنگ بابا نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا "انوشا بیٹے!"

میں نے سر اُٹھا کر اُن کی طرف دیکھا۔ میری آنکھوں میں آنسو تیر رہے تھے۔ یہ دیکھ کہ وہ کہنے لگے:

"انوشا بیٹے، میں جانتا ہوں تُم کیا سوچ رہے ہو۔ لیکن یاد رکھو قُدرت کے ہر کام

میں کُچھ نہ کُچھ بھلائی ہوتی ہے۔ کون جانے یہ سب کُچھ بھی کسی کی بھلائی کے لیے ہوا ہو۔ جو کُچھ ہونا تھا ہو چکا۔ جو ایک بار اِس جہاں سے چلا گیا، چلا گیا۔ پھر دُنیا کی کوئی طاقت اُسے واپس نہیں لا سکتی۔ اپنے آنسو پونچھ ڈالو۔ آؤ، اب چلیں!" اور یہ کہتے ہوئے سارنگ بابا مُجھے اور اُوشا کو لے کر چل دیے۔ چلتے چلتے میں نے ایک نظر چندر گُپت پر ڈالی۔ وہ کُچھ کہنا چاہتا تھا۔ شاید بہت کُچھ کہنا چاہتا تھا۔ لیکن یہ محسوس کر رہا تھا کہ اُس کے لیے یہ جگہ اور یہ وقت مناسب نہیں ہے۔ وہ سر جھکائے خاموش کھڑا رہا اور ہم اُس کے پاس سے چُپ چاپ گزر گئے۔

مگدھ کی طرف

اگلے روز ہی ہمیں پتا چل گیا کہ جو کُچھ بھی ہوا ہے چندر گُپت کی بھلائی کے لیے ہوا ہے۔ پُونچھ کے راجا پر دانک نے چندر گُپت کو اُس وقت اپنی پناہ میں لیا تھا جب وہ سکندر کے دربار سے فرار ہو کر اپنی جان بچاتا پھِر رہا تھا۔ مشرق میں نند خاندان کا راجا سدھا نند اُس کے خُون کا پیاسا تھا اور مغرب میں سکندر نے اُسے قتل کر ڈالنے کا حکم دیا تھا۔ اِس حالات میں جس شخص نے جرأت سے کام لے کر چندر گُپت کو پناہ دی تھی، وہ پُونچھ کا راجا پر دانک تھا۔ اُس نے چندر گُپت کو پناہ ہی نہیں دی تھی، اپنی بیٹی بھی اُس سے بیاہ دی تھی۔

اور اب شیش ناگ کے اِس بیٹے نے راجا پردانک کے احسان کا بدلہ یوں اُتارا تھا کہ پردانک کے بیٹے کو ٹیکسلا کا حاکم مقرّر کر دیا تھا۔ یوں دریائے سندھ سے لے کر دریائے جہلم تک کا وہ علاقہ، جس پر کبھی میرے باپ کی حکومت تھی، اب راجا پردانک کا بیٹا اُس کا راجا بن گیا تھا۔

نئے راجا کی خوشی میں جشن منایا جانا تھا اور چندر گُپت نے اِس جشن میں بڑے جوش و خروش سے حصّہ لیا۔ اور حصّہ لیتا بھی کیوں نہ۔ اُس کی بیوی کا بھائی جو ٹیکسلا کا راجا بن گیا تھا۔

لیکن میرا دِل ٹیکسلا اور جشنوں سے بھر چُکا تھا۔ پہلے کی طرح اِس بار بھی پہلے اِس شہر نے میرے پاؤں میں بیڑیاں ڈال دی تھیں۔ پہلے جب ہم پشکلاوتی جانے کے اِرادے سے یہاں آئے تھے تو سکندر کے دربار میں پہنچ کر ہمارے ساتھ وہ ماجرا پیش آیا تھا جو ہمارے وہم و گمان میں بھی نہ تھا اور اُس کے نتیجے میں ہم سکندر کے ساتھ چپک کر رہ گئے تھے اور پھر سائے کی طرح اُس کے ساتھ ساتھ رہے تھے۔

اور اب ہم دوبارہ راجا امبھی کی دعوت پر چندر گُپت کے ساتھ، ٹیکسلا آئے تھے تو اوپر تلے کئی ایسے واقعات پیش آ گئے تھے جن کے متعلّق میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ چندر گُپت کا استقبال سکندر کے استقبال سے کہیں بڑھ کر ہوا تھا۔ راجا امبھی کے بیٹے نے خود اپنے باپ کا سر کاٹ کر چندر گُپت کو تُحفے کے طور پر پیش کیا تھا اور چندر گُپت نے اُسے ٹیکسلا کا راجا بنا دیا تھا۔ لیکن دوسرے روز ہی تقدیر کے زبردست ہاتھ نے اُسے ٹیکسلا کی راج گدّی سے اُٹھا کر اپنے باپ کے پاس پہنچا دیا تھا۔ اور اب میرے باپ کی گدّی راجا پر دانک کے بیٹے کے ہاتھ آ گئی تھی۔ اپنی پیدائش سے سے لے کر اب تک میرے ساتھ شہر میں جو کُچھ ہوا تھا، اس کی یاد میرے لیے خوشی نہیں، تکلیف کا باعث تھی۔ اِس شہر میں جو واقعات میرے ساتھ پیش آئے تھے، میں انہیں بھُول جانا چاہتا تھا۔ میں اس شہر سے اپنا ناتا توڑ لینا چاہتا۔ میں جلد سے جلد اس شہر سے کہیں اور چلا جانا چاہتا تھا اور میں نے جی میں ٹھان لی تھی کہ ایک بار اس شہر کو چھوڑ دینے کے بعد دوبارہ اِس کا رُخ بھی نہیں کروں گا۔

ایسے میں ایک شام چندر گُپت ہمارے پاس آیا، لیکن اِس بار وہ اکیلا نہیں تھا۔ اس کا وزیر چانکیہ بھی اُس کے ساتھ تھا۔ سارنگ بابا پہلے کی طرح فرش پر پاؤں پسارے ستون سے ٹیک لگائے بیٹھے تھے۔ اُوشا اپنے پالتو سانپ امبر سے کھیل رہی تھی۔ میں ایک ستون سے ٹیک لگائے کھڑا تھا اور شانی میرے گلے میں جھُول رہا تھا۔ چندر گُپت اور چانکیہ نے آکر آداب کیا اور پھر وہ دونوں میرے پاس آکھڑے ہوئے۔ چندر گُپت نے میرے سامنے آکر پھر جھک کر آداب کیا اور کہنے لگا:

"انوشا مہاراج! شیش ناگ کا بیٹا یہ پوچھنے آیا ہے کہ اُسے مگدھ کی طرف جانے کی اجازت کب ملے گی؟"

"ابھی اِسی وقت۔" میں نے کہا۔ "شیش ناگ کے بیٹے! تُم چاہو تو اِسی وقت مگدھ کی طرف روانہ ہو سکتے ہو۔"

"دیکھا مہاراج۔" چانکیہ نے چندر گُپت سے کہا۔ "میں نے کہا نہیں تھا کہ اب

میدان صاف ہی صاف ہے۔"

چندر گُپت نے مُجھ سے مخاطب ہو کر کہا۔ "انوشا مہاراج! آپ کے اِن الفاظ نے میرے دِل کو ایک نیا حوصلہ بخش دیا ہے۔ میں خود بھی پاٹلی پُتر کو دیکھنے کے لیے تڑپ رہا ہوں، لیکن چانکیہ جی کا کہنا ہے کہ مُجھ سے پہلے کسی اور کا جانا بہتر رہے گا۔"

اور یہ الفاظ کہنے کے بعد چندر گُپت نے قریب بیٹھی ہوئی اُوشا سے کہا۔ "کیا تمہیں اپنا وہ وعدہ یاد ہے جو تُم نے اِس شہر میں اپنے بے آسرا بھائی سے کیا تھا؟"

اُوشا چندر گُپت کے سامنے آ کھڑی ہوئی اور بولی۔ "شیش ناگ کے بیٹے! شیش ناگ کی بیٹی کو اپنا وعدہ اچھّی طرح یاد ہے۔ اُس نے شیش ناگ کی قسم کھا کر وعدہ کیا تھا کہ وہ وقت آنے پر اپنے بھائی کی پوری پوری مدد کرے گی۔ ہر طرح سے مدد کرے گی۔ اپنی جان دے کر بھی مدد کرے گی۔"

"تو اب اُس کا وقت آ گیا ہے، چانکیہ جی تمہیں مگدھ بھیجنا چاہتے ہیں۔"

”میں حاضر ہوں۔“ اُوشا نے کہا۔ ”جب کہو گے مگدھ کی طرف روانہ ہو جاؤں گی۔“

”اور میں بھی اُوشا کے ساتھ جاؤں گا۔“ میں نے تیزی سے کہا۔

میری یہ بات سُن کر چندر گُپت اور چانکیہ دونوں نے پلٹ کر میری طرف دیکھا۔ اُن کی نگاہوں میں حیرانی بھی تھی اور خوشی بھی۔ چندر گُپت نے آگے بڑھ کر میرے دونوں ہاتھ تھام لیے اور بولا۔

”یہ تو ہماری بہت بڑی خوش قسمتی ہو گی مہاراج! میں سمجھتا ہوں کہ آپ کا مگدھ جانا ایک طرح سے ہمارے لیے کامیابی کی دلیل ہے۔ میں دِل سے تو یہی چاہتا تھا لیکن آپ سے اِس کی درخواست کرنا میرے لیے مُمکن نہ تھا۔ میں پہلے بھی اِس حیثیت میں نہیں تھا اور اب سارے راج پاٹ کے باوجود بھی اِس حیثیت میں نہیں ہوں کہ اُوشا کی طرح آپ سے کوئی قول لے سکوں۔ لیکن مُجھے اُس وقت بھی اطمینان تھا اور اب بھی اطمینان ہے کہ جب بھی وقت آیا، جہاں بھی آیا،

آپ میری حفاظت کریں گے۔"

"شیش ناگ کے بیٹے! تُم سارنگ بابا کو کیوں بھولے جارہے ہو؟" سارنگ بابا کی اِس بات سے چندر گُپت اور چانکیہ ہی نہیں، میں اور اُوشا بھی چونک پڑے۔ سارنگ بابا نے اپنی بات جاری رکھی۔

"کیا تُم یہ سمجھتے ہو کہ انوشا اور اُوشا مگدھ روانہ ہو جائیں گے اور اُن کا سانگ بابا یہاں فرش پر پاؤں پسارے ستون سے ٹیک لگائے بیٹھا رہے گا؟"

چندر گُپت نے فوراً آگے بڑھ کر سارنگ بابا کے پاؤں پکڑ لیے اور کہنے لگا: "مُجھ سے بھول ہوئی، سارنگ مہاراج! بات یہ ہے کہ میں تو انوشا مہاراج سے مگدھ جانے کے لیے نہیں کہہ سکتا تھا، آپ سے یہ درخواست کرنے کا حوصلہ کہاں سے لاتا۔"

"کوئی بات نہیں، شیش ناگ کے بیٹے!" سارنگ بابا مُسکراتے ہوئے بولے۔ "تُو یہاں آیا ہے تو سن! ہم تینوں مگدھ کی طرف روانہ ہوں گے۔ اب تُو ہمیں یہ بتا کہ

کب جانا ہے؟ کِس کے پاس جانا ہے؟ کیا کہنا ہے؟ کیا کرنا ہے؟" اس پر چانکیہ آگے بڑھا اور کہنے لگا۔ "یہ میں بتاتا ہوں مہاراج۔"

یہ کہہ کر چانکیہ سارنگ بابا کے قدموں میں بیٹھ گیا۔ سارنگ بابا نے مُجھے اور اُوشا کو بھی اپنے پاس بٹھالیا۔ یہ دیکھ کر چندرگُپت بھی سارنگ بابا کے قدموں میں بیٹھ گیا اور اِس کے بعد چانکیہ نے بتایا کہ ہمیں پاٹلی پُتر پہنچ کر کِس سے ملنا ہے، کیسے ملنا ہے، اُس سے کیا کہنا ہے، کیا کرنا ہے اور کِس طرح کرنا ہے؟

چانکیہ کی باتوں سے ہمیں معلوم ہوا کہ مگدھ کی طاقت ور سلطنت اگرچہ ستلج سے لے کر مشرق میں سمندر کے کناروں تک پھیلی ہوئی ہے، لیکن اُس کے نیچ ذات کے راجا سدھانند کے ظُلم و سِتم کی وجہ سے لوگ اُس سے دُکھی ہیں اور اُس سے نجات حاصل کرنے کی دُعائیں مانگتے ہیں۔ اُن کے دِلوں میں راجا کے خلاف نفرت کی آگ سُلگ رہی ہے اور وہ کسی ایسے آدمی کی راہ دیکھ رہے ہیں جو آگے بڑھ کر اُنہیں سہارا دے اور اُس آگ کو اپنی دلیری اور ہمّت سے یُوں ہوا دے

کہ راجا سدھانند اپنے ظُلم و سِتم کے ساتھ اِس آگ میں جل کر راکھ ہو جائے۔

چانکیہ نے یہ بھی بتایا کہ خود راجا کے دربار میں اُس کے بہت سے درباری راجا سے تنگ آئے ہوئے ہیں، لیکن جان کے خوف سے زبان نہیں کھولتے اور تو اور راجا سُدھانند کا وزیر شکاتولہ بھی اُس سے تنگ ہے۔ راجا نے اُس کے ساتھ کئی زیادتیاں کی ہیں اور وہ اِن زیادتیوں کا انتقام لینا چاہتا ہے۔ چانکیہ تو اپنی توہین اور بے عزّتی کو برداشت نہ کرتے ہوئے اپنا کشکول توڑ کر بھرے دربار سے نکل آیا تھا، لیکن شکاتولہ زیادتیوں کے باوجود ظاہری طور پر ابھی تک راجا کا وفادار تھا۔

اِس ظاہری وفاداری کے باوجود شکاتولہ نے راجا سُدھانند سے بدلہ لینے کی ایک ترکیب سوچی تھی۔ لیکن اِس ترکیب پر اکیلے عمل کرنا اُس کے لیے مُمکن نہ تھا۔ اُسے معلوم تھا کہ چانکیہ نے بے عزّتی کے بعد، بھرے دربار میں اپنا کشکول توڑتے ہوئے یہ قسم کھائی تھی کہ جب تک وہ مگدھ کی سلطنت کو تباہ نہیں کرے گا چین سے نہیں بیٹھے گا۔

شکاتولہ کو یہ بھی معلوم ہو گیا تھا کہ شیش ناگ خاندان کا ایک شخص زندہ بچ کر ستلج کے پار چلا گیا ہے۔ پھر اُسے یہ بھی معلوم ہو گیا تھا کہ یہ شہزادہ چندر گُپت، بیاس سے سندھ تک کے علاقے کا مالک بن چُکا ہے اور چانکیہ اُس کے ساتھ ہے۔ اور یہ سب کُچھ معلوم ہونے کے بعد شکاتولہ نے خُفیہ طور پر چانکیہ کو پیغام بھیجا تھا۔ اُس نے راجا سدھانند سے بدلہ لینے کے لیے جو ترکیب سوچی تھی، وہ اس ترکیب پر عمل کرنے کے لیے چانکیہ کی امداد چاہتا تھا۔

اب چانکیہ اُوشا کو پاٹلی پُتر بھیجنا چاہتا تھا۔ شکاتولہ نے کیا ترکیب سوچی تھی؟ چانکیہ کو وہ ترکیب معلوم تھی یا نہیں؟ چانکیہ کی باتوں سے اُس کا کوئی سُراغ نہیں ملتا تھا۔ لیکن ہمیں اِس سے کُچھ غرض نہ تھی۔ ہمیں کسی قافلے کے ساتھ سفر کرتے ہوئے پاٹلی پُتر پہنچنا تھا۔ وہاں محل کے پاس ایک سرائے میں ٹھہرنا تھا۔ پھر شکاتولہ سے مل کر اُس کی ہدایت کے مطابق کام کرنا تھا۔ گویا ہمیں پاٹلی پُتر پہنچ کر شکاتولہ سے ملے بغیر یہ معلوم نہیں ہو سکتا تھا کہ ہمیں کیا کرنا ہے اور کیسے کرنا ہے۔ لیکن ہمیں اِس سے غرض بھی نہیں تھی۔

میرے لیے تو اطمینان کی بات صرف یہی تھی کہ ٹیکسلا کو چھوڑ دینے کی ایک صورت نکل آئی ہے۔ اُوشا بھی ایک مدّت سے اداس اور چُپ چُپ سی تھی اور میری طرح ٹیکسلا کی زندگی نے اُسے بھی بیزار کر رکھا تھا۔ رہے سارنگ بابا تو وہ ایک ایسا سمندر تھے جس کی کوئی تھاہ ہی نہ تھی۔ مُجھے نہیں معلوم کہ وہ کیا سوچتے تھے، لیکن میں جانتا تھا کہ جو کُچھ وہ دیکھتے ہیں، دوسرے نہیں دیکھ سکتے۔ جو کُچھ وہ جان لیتے ہیں، دوسرے نہیں جان سکتے۔ اُنہوں نے میرے اور اُوشا کے ساتھ مگدھ جانے کی ہامی بھر لی تھی، اور یہی بات میرے نزدیک بہت بڑی بات تھی۔

چندر گُپت اور چانکیہ کے ساتھ اِس ملاقات کے چند روز بعد ہی سارنگ بابا، میں اور اُوشا مگدھ کی ریاست کی طرف روانہ ہو گئے۔

بھیشم کی قربانی

ہم ٹیکسلا سے دریائے بیاس تک اسی راستے سے آئے جس راستے سے سکندر بیاس تک آیا تھا اور دریائے بیاس کو بھی ہم نے اُس جگہ سے عبور کیا جہاں سکندر نے اپنی واپسی کی نشانی کے طور پر بارہ ستون تعمیر کرائے تھے اور پھر اُن ستونوں پر دیوتاؤں کے نام پر قربانیاں دی تھیں۔

دریائے ستلج کو پار کر کے ہم مگدھ کی سلطنت کی حد میں داخل ہوئے اور یاتریوں کے ایک ایسے گروہ کے ساتھ ہو لیے جو مقدس مقامات کی یاترا کرنے نکلا تھا۔ ہم

چاہتے تو آنکھ جھپکتے میں مگدھ کے دار الحکومت پاٹلی پُتر پہنچ سکتے تھے لیکن سارنگ بابا کے نزدیک مناسب یہی تھا کہ وقت کی باگیں اپنے ہاتھ میں لینے کے بجائے اپنی باگیں وقت کے ہاتھ میں دے دی جائیں۔ اِسی لیے ہم یاتریوں کے قافلے میں شامل ہو کر یاتری بن گئے تھے اور شہر شہر کی یاترا کرتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے۔ اِسی طرح شہر شہر کی سیر کرتے ہوئے ہم کوروکشیتر پہنچے۔ یہ وہ شہر تھا جہاں کورووں اور پانڈووں کے درمیان مہابھارت کی خوف ناک جنگ ہوئی تھی۔

یہ کئی ہزار سال پہلے کی بات تھی، جب ہستنا پور کے راجا شانتنو نے دریائے گنگا کی لہروں سے نکلنے والی ایک پُر اسرار عورت سے شادی کی تھی۔ اُس عورت نے شادی کے وقت راجا شانتنو سے ایک قول لیا تھا:

”اے راجا! تُو چاہے کُچھ دیکھے اور میں چاہے کُچھ کروں، تُو کوئی سوال نہیں کرے گا اور نہ کوئی بات کہے گا۔“

راجا شانتنو نے یہ قول دے دیا تھا اور دونوں کی شادی ہو گئی تھی۔ شادی کے بعد اُن کے ہاں سات بچّے پیدا ہوئے لیکن وہ عورت ہر بچّے کو پیدا ہوتے ہی دریا میں ڈال دیتی۔ شانتنو یہ سب کُچھ دیکھ کر صبر کرتا رہا اور اُس نے اِس بارے میں اپنی زبان سے ایک لفظ تک نہ کہا۔ صرف اِس لیے کہ وہ اپنے قول کی لاج رکھنا چاہتا تھا۔ مگر جب وہ عورت اُس کے آٹھویں بچّے کو دریا کی لہروں میں ڈالنے گئی تو راجا سے صبر نہ ہو سکا اور وہ چیخ اُٹھا۔ ''رُک جاؤ بے رحم عورت!''

اِس پر وہ عورت بچّہ راجا شانتنو کی گود میں ڈال کر دریا میں کُود گئی اور جس طرح گنگا کی لہروں سے نکلی تھی اُسی طرح غائب ہو گئی۔

راجا شانتنو نے اُس بچّے کا نام بھیشم رکھا اور بڑے چاؤ اور لاڈ سے اُس کی پرورش کی۔ بھیشم بھی ایسا ہونہار نکلا کہ اُس کی قابلیت کے چرچے دور دور تک ہونے گئے۔ اُس جیسا خوبصورت کوئی نہ تھا اس جیسا نیک اور فرماں بردار کوئی نہ تھا۔ اُس جیسا عقل مند کوئی نہ تھا۔ حال آں کہ ابھی اُس کی عُمر مُشکل سے بارہ چودہ سال

تھی۔

جب بھیشم کی تعلیم و تربیت ختم ہوئی اور وہ ہر علم اور ہر فن میں ماہر ہو گیا تو راجا شانتنو نے ایک جشن منایا اور اُس جشن میں بھیشم کے ولی عہد ہونے کا اعلان کیا۔ یوں بھی اُس کے ہاں بھیشم کے سوا اور کوئی اولاد نہ تھی، اِس لیے اُس کے بعد تاج اور تخت کا وارث بھیشم کو ہی بننا تھا۔ لیکن انسان سوچتا کُچھ ہے اور ہوتا کُچھ اور ہے!

اس جشن کے چند روز بعد کی بات ہے کہ راجا شانتنو شکار کے ارادے سے نکلا۔ اِس دوران اُس کی نظر ایک مچھیرے کی لڑکی سیتا وتی پر پڑی۔ شانتنو نے لڑکی کو دیکھتے ہی فیصلہ کر لیا کہ وہ اُس سے شادی کرے گا اور اُسے اپنے راج محل میں رانی بنا کر رکھے گا۔ ستیہ وتی کا باپ اپنی بیٹی کی شادی راجا شانتنو کے ساتھ کرنے پر آمادہ نہ تھا۔ اُسے ڈر تھا کہ نیچ ذات مچھیرے کی بیٹی ہونے کی وجہ سے اُس کی اولاد کو تخت و تاج کا حق دار نہیں سمجھا جائے گا۔ اِس لیے جب راجا شانتنو نے سیتا وتی

سے شادی کی خواہش ظاہر کی تو اُس نے ایک شرط رکھی۔ اُس نے کہا۔

”مہاراج، میری بیٹی کی شادی آپ سے صرف اُس صورت میں ہو سکتی ہے جب آپ یہ قول دیں کہ آپ کے بعد میری بیٹی کی اولاد تخت پر بیٹھے گی۔“

راجا شانتنو کے لیے اس شرط کو تسلیم کر لینا مُمکن نہ تھا کیوں کہ چند روز پہلے ہی وہ جشن میں بھیشم کی ولی عہدی کا اعلان کر چکا تھا۔ دوسری طرف ستیہ وتی سے شادی بھی کرنا چاہتا تھا۔ وہ ہر وقت اُداس اور غمگین رہنے لگا۔ بھیشم سے باپ کی اداسی دیکھی نہ گئی۔ اُس نے باپ سے اِس اداسی کا سبب پُوچھا تو اُس نے ٹال دیا۔ اِس پر بھیشم نے خود ٹوہ لگائی اور اپنے باپ کی اُداسی کا راز معلوم کر لیا۔ وہ سیدھا ستیہ وتی کے باپ کے پاس پہنچا اور کہنے لگا۔

”تو اپنی بیٹی کی شادی میرے باپ سے اِس لیے نہیں کرنا چاہتا کہ میرے باپ کے بعد تیری بیٹی کی اولاد کو تخت نہیں ملے گا؟ میں تُجھے قول دیتا ہوں کہ میں تیری بیٹی کی اولاد کے حق میں اپنی ولی عہدی سے دست بردار ہو جاؤں گا۔“

لیکن سیتا وتی کے باپ کے نزدیک بھیشم کا یہ قول بے معنی تھا۔ اُس نے کہا۔ ”اے بھیشم! تیرے قول سے کیا ہوتا ہے۔ تُو ولی عہدی سے دست بردار ہو سکتا ہے لیکن ضروری نہیں کہ تیری اولاد بھی اِسی طرح تخت سے دست بردار ہونے کا وعدہ کرے۔“

یہ سُن کر بھیشم نے کہا۔ ”تو ٹھیک کہتا ہے۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ تمام عُمر شادی نہیں کروں گا۔ بول! آپ کیا کہتا ہے؟“

سیتا وتی راجا شانتنو کی رانی بن کر ہستنا پور کے راج محل میں پہنچ گئی۔ بھیشم نے اپنے قول کے مطابق ساری عُمر شادی نہیں کی۔ راجا شانتنو کے مرنے کے بعد بھیشم کے بجائے سیتا وتی کا بیٹا تخت پر بیٹھا۔ اُس کا نام چتر ویریا تھا۔ چونکہ وہ ابھی بہت چھوٹا تھا، اِس لیے سلطنت کا کام بھیشم اور ستیہ وتی کرتے تھے۔

جب چتر ویریا شادی کی عُمر کو پہنچا تو بھیشم نے اُس کی شادی کاشی کے راجا کی بیٹی کے ساتھ کر دی۔ چتر ویریا تھوڑا عرصہ حکومت کرنے کے بعد اِس دُنیا سے کُوچ

کر گیا۔ اُس کے دو لڑکے تھے۔ بڑے کا نام دھرت راشٹر ا اور چھوٹے کا نام پانڈو تھا۔ دھرت راشٹر پیدائشی اندھا تھا اِس لیے چتر ویریا کے مرنے کے بعد ہستنا پور کی راج گدّی پر پانڈو بیٹھا۔

پانڈو کی دو بیویاں تھیں: رانی کنتی اور مادری۔ اُن دونوں رانیوں سے اُس کے پانچ بیٹے تھے، !یُدھشٹرِ، بھیم اور ارجُن رانی کنتی سے تھے اور نکل اور شہدیو رانی مادری سے۔ ان پانچوں کو اپنے باپ کے نام پر پانڈو کہا جاتا تھا۔

پانڈو کے مرنے پر اُس کے پانچوں بیٹے چھوٹی عُمر کے تھے، اِس لیے اُن کا چچا دھرت راشٹر اندھا ہوئے کے باوجود ہستنا پور کے تخت پر بیٹھا۔ دھرت راشٹر کے ایک سو بیٹے تھے۔ اُس کے سب سے بڑے بیٹے کا نام دریودھن تھا۔ دھرت راشٹر کے اُن تمام بیٹوں کو اُس کے ایک بزرگ کے نام پر کورو کے نام سے یاد کیا جاتا تھا۔

پانڈو کے پانچوں بیٹوں نے دھرت راشٹر کے بیٹوں کے ساتھ ہی تعلیم پائی۔ اُن

سب کا استاد ایک ہی شخص درون اچاریہ تھا جس نے اُنہیں ہر قسم کی تربیت دینے میں کوئی کسر نہیں اُٹھا رکھی تھی۔ مگر پانچوں پانڈو بھائی کوروؤں کے مُقابلے میں زیادہ ذہین ثابت ہوئے۔

یدھشٹِر دانائی میں، بھیم طاقت اور شہ زوری میں اور ارجُن تیر اندازی میں اپنا جواب نہیں رکھتا تھا۔ نکل اور سہدیو بھی اپنی خوبیوں کے لحاظ سے اپنا جواب آپ تھے۔

پانڈو بھائیوں کی اِن خوبیوں کی وجہ سے کوروؤں کے دِل میں حسد کی آگ بھڑک اُٹھی۔ چنانچہ جب دھرت راشٹر نے یُدھشٹِر کو اپنا ولی عہد مقرّر کرنا چاہا تو اُس کے بیٹے اُس کے خلاف ہو گئے۔ اپنے بیٹوں کے بہکانے اور ڈراوے میں آ کر دھرت راشٹر نے پانڈوؤں کو حکم دیا کہ وہ ہستنا پور سے کہیں اور چلے جائیں۔ پانڈو بھائیوں نے جب حالات کا یہ نیا رُخ دیکھا تو وہ ہستنا پور کو چھوڑ کر پورب کی طرف نکل گئے۔

دھرت راشٹر کا بڑا بیٹا دریودھن تو پانڈوؤں کا جانی دُشمن تھا اور کسی نہ کسی طرح
انہیں تباہ و برباد کر دینا چاہتا تھا۔ جب اُسے یہ خبر ملی کہ پانچوں پانڈو بھائی صحیح
سلامت پریاگ جا پہنچے ہیں تو اُنہیں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ختم کر دینے کے منصوبے
باندھنے لگا۔

دریودھن نے ایک ایسی چال چلی جو بڑی ہی خوف ناک تھی۔ وہ اُن کے پاس
پریاگ پہنچا، اُن سے اپنے پچھلے سلوک کی معافی مانگی اور پھر اصرار کیا کہ وہ اُس
کے ساتھ واپس ہستناپور چلیں۔ پانڈو بھائیوں نے نہ صرف دریودھن کے پچھلے
سلوک کو دِل سے بھُلا دیا بلکہ اُس کے ساتھ واپس ہستناپور کی طرف چل دیے۔
اُن کو یہ معلوم نہ تھا کہ دریودھن کے دِل میں اُن کے لیے غصّہ ہی غصّہ اور آگ
ہی آگ ہے۔

راستے میں دریودھن نے پانڈوؤں کو ایک ایسے مکان میں ٹھہرایا جو اُس نے پہلے
ہی خاص طور سے اُن کے لیے بنوایا تھا۔ اِس مکان کی دیواروں پر لاکھ کا روغن

تھا۔ ستونوں کے لیے بانس استعمال کیے گئے تھے اور اُس کی چھت پر تیل کا چھڑکاؤ کر دیا گیا تھا۔

رات کے وقت جب پانچوں پانڈو بھائی سو گئے تو دریودھن خاموشی کے ساتھ باہر نکلا اور تمام دروازے بند کر کے مکان کو آگ لگا دی۔ اُس کا خیال تھا کہ سوتے ہیں اُس کے پانچواں دُشمن آگ میں جل کر ختم ہو جایئے۔

آگ کی تپش اور جلتی ہوئی لکڑیوں کے چٹخنے سے پانڈو ہڑبڑا کر جاگے تو اُنہوں نے موت کو اپنے سروں پہ ناچتے دیکھا۔ وہ فوراً سمجھ گئے کہ یہ دریودھن کی کارستانی ہے۔

پانچوں بھائیوں نے اپنے اوسان بجا رکھے اور چیختے چلّانے یا شور مچانے کے بجائے اُنہوں نے فرش کے نیچے سے ایک سُرنگ بنا کر اپنے بچاؤ کا راستہ ڈھونڈ لیا۔ اس کے بعد اُنہوں نے برہمنوں کا بھیس بدل لیا اور اُس بھیس میں اِدھر اُدھر پھِرتے آخر وہ پنچال کے علاقے میں جا پہنچے۔

پنچال کا راجا دروپد اس وقت اپنی خوب صورت بیٹی دروپدی کی شادی کے لیے سوئمبر کا انتظام کر رہا تھا۔

دروپدی خوب صورتی اور عقل مندی کے باعث دُور دُور تک مشہور تھی۔ اُسے حاصل کرنے کے لیے دُور دُور سے بڑے بڑے راجے مہاراجے چلے آ رہے تھے، جن میں کورو بھائی بھی شامل تھے۔

سوئمبر کے لیے مُقابلے کی جگہ راجدھانی کے شمال مشرق میں ایک وسیع اور ہموار میدان میں بنائی گئی تھی۔ اس کے گرد راجاؤں اور راج کُماروں کے ٹھہرنے کے لیے محل بنائے گئے تھے۔ ہر محل کی سات منزلیں تھیں اور ہر ایک کے سو دروازے تھے۔ ہر محل اگر لوبان اور دوسری خوشبوؤں میں بسا ہوا تھا۔

پندرہ دِن تک دُور دُور سے راجے اور راج کُمار مُقابلے میں حِصّہ لینے کے لیے آتے رہے۔ سولھواں دِن مُقابلے کا دِن تھا۔ صُبح ہی صُبح لوگ یہ مُقابلہ دیکھنے کے لیے میدان میں اُن جگہوں پر بیٹھ گئے جو تماشائیوں کے لیے بنائی گئی تھیں۔

مقرّرہ وقت بعد دروپدی نہایت خوب صورت لباس پہنے، ہاتھوں میں ایک سنہری تھال لیے، اپنے باپ اور بھائی کے ساتھ آئی۔ اِس تھال میں وہ ہار پڑا تھا جو دروپدی کو مُقابلہ جیتنے والے شخص کے گلے میں ڈالنا تھا۔

سب سے پہلے آگ جلا کر دیوتاؤں کے نام پر قربانی دی گئی اور پھر دروپدی کے بھائی نے مُقابلے کی شرط کا اعلان کیا۔ یہ شرط کوئی معمولی شرط نہ تھی۔ ایک بڑے سے ستون کے سِرے پر ایک چکّر گھومتا ہوا نظر آتا تھا۔ اِس چکّر کے عین درمیان میں ایک سنہری مچھلی بنی ہوئی تھی۔ مُقابلے میں حصّہ لینے والوں کو اِس سُنہری مچھلی کی آنکھ کو نشانہ بنانا تھا۔ جس شخص کا تیر اُس سُنہری مچھلی کی آنکھ کو چھید ڈالتا، وہی دروپدی کا حق دار ہو سکتا تھا۔

مُقابلے کا اعلان ہونے کے بعد راجے، مہاراجے اور راج کُمار ایک ایک کر کے مُقابلے میں اُترنے لگے۔ ہر ایک نے اپنی سی کوشش کی مگر کوئی بھی کامیاب نہ ہو سکا۔ کوروؤں نے بھی اپنی قسمت آزمائی، لیکن کوشش کرنے کے باوجود ناکام

رہے۔

اِس سوئمبر میں پانچوں پانڈو بھائی بھی موجود تھے، لیکن راجوں اور راج کُماروں کی حیثیت سے نہیں، برہمنوں کے روپ میں۔ راجاؤں اور راج کُماروں کو ناکام ہوتے دیکھ کر اچانک ارجُن کو ہوش آیا اور وہ لوگوں کو ہٹاتا ہوا آگے بڑھا۔ اُس نے کمان اُٹھائی اور پہلے ہی تیر سے سنہری مچھلی کی آنکھ کو چھید ڈالا۔ تماشائیوں نے خوشی کے نعرے لگائے۔ دروپدی نے آگے بڑھ کے سنہری تھال میں رکھا ہوا ہار اُٹھایا اور ارجُن کے گلے میں ڈال دیا۔

دروپدی کا باپ اِس خیال سے اُداس ہو گیا کہ اُس کی بیٹی کی شادی کسی راجا کے بجائے ایک برہمن سے ہو رہی ہے۔ لیکن جب اُسے معلوم ہوا کہ شرط جیتنے والا والا کوئی برہمن نہیں بلکہ ارجُن پانڈو ہے تو اُس کی خُوشی کی کوئی حد نہ رہی۔ اُس نے دروپدی کا ہاتھ ارجُن کے ہاتھ میں دے دیا۔

پنچال کے راجا دروپد کے ساتھ رشتہ داری قائم ہو جانے کے بعد پانڈو بھائیوں

نے اُس کے اثر اور رسوخ سے کام لینے کی سوچی اور دھرت راشٹر کو اِس بات پر مجبور کیا کہ پانڈوؤں کو بھی حکومت میں حصّہ دیا جائے۔ چنانچہ ریاست کو دو حصّوں میں تقسیم کر دیا گیا۔ مشرق کی طرف کا آباد علاقہ کوروؤں نے اپنے پاس رکھا اور مغرب کی طرف کے بے آباد اور جنگل والے علاقے کو پانڈوؤں کے حوالے کر دیا۔ پانڈوؤں نے اپنی محنت اور ہمّت سے اِس علاقے کو آباد کیا اور اندر پرستھ کے نام سے ایک شہر بنا کر اُسے اپنی راجدھانی بنالیا۔ یہ شہر اُس جگہ آباد تھا جہاں اب ہندوستان کا دارالحکومت دہلی آباد ہے۔

دریودھن اور اُس کے کورو بھائی پانڈوؤں کی خوش حالی اور ترقّی کو ٹھنڈے پیٹوں برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ چنانچہ وہ دریودھن نے جو ایک طرح سے کورو بھائیوں کا دماغ تھا، ایک چال چلی اور یُدھشٹِر پانڈو کو جُوا کھیلنے کی دعوت دی۔ انکار کا مطلب اپنی ہار مان لینا تھا۔ اِس لیے یُدھشٹِر نے یہ دعوت قبول کر لی۔

یُدھشٹِر اپنے بھائیوں اور دروپدی کے ساتھ جُوا کھیلنے آیا، مگر جوئے کے پانسے

ایسی ترکیب سے بنائے گئے تھے کہ ہر بار دریودھن کی جیت ہوتی تھی۔ یُدھشٹِر ہارتا جارہا تھا لیکن ہر ہار سے اُس کا جوش کم ہونے کی بجائے اور بڑھ جاتا تھا۔ اِس جوش میں اُس نے اپنا سب کُچھ گنوا دیا۔ پہلے وہ مال و دولت ہارا، پھر اپنی حکومت ہارا، پھر اپنے بھائیوں، اپنے آپ اور یہاں تک کہ دروپدی کو ہار گیا۔

کورو بھی یہی چاہتے تھے۔ پانڈوؤں کی دولت اور حکومت کے علاوہ پانچوں پانڈو بھائی اور دروپدی بھی اُن کے قبضے میں آ گئے تھے۔ اُنھوں نے دروپدی کو اُس کے کمرے سے گھسیٹ کر بھری محفل میں ذلیل اور بے عزّت کرنے کی کوشش کی لیکن قدرت کی اَن دیکھی طاقتیں اُس کی حفاظت کر رہی تھیں۔ عین اُس وقت کوروؤں کا اندھا باپ دھرت راشٹر اُس محفل میں چلا آیا اور اُس کے آنے سے کوروؤں کی بدنیتی کا یہ سِلسِلہ رُک گیا۔ اُس نے دروپدی کو دِلاسا دیا۔ اور کوئی سی تین خواہشیں ظاہر کرنے کو کہا۔ اِس پر دروپدی نے خواہش ظاہر کی کہ یُدھشٹِر اور اُس کے بھائیوں کو آزاد کر دیا جائے۔ اُس نے حکومت اور مال دولت واپس لینے کی خواہش بالکل نہیں کی کیونکہ اُسے یقین تھا کہ پانڈوؤں کے آزاد

ہونے پر یہ سب کُچھ پھر حاصل کیا جا سکتا ہے۔

آخر فیصلہ اِس بات پر ہوا کہ پانچوں پانڈو بارہ برس کے لیے جنگلوں میں رہیں۔ پھر تیرھویں سال اگر وہ کوروؤں کی نگاہوں سے اوجھل رہ سکے تو اُن کی حکومت اُنہیں واپس کر دی جائے گی اور اگر ایسا نہ ہو سکا تو اُنہیں ایک بار پھر بارہ برس جنگلوں میں گزارنے ہوں گے۔

پانڈو بھائی دروپدی کو ساتھ لے کر جنگلوں کی طرف نکل گئے اور پورے بارہ سال تک جنگلوں کی خاک چھانتے رہے۔ تیرھویں برس اُنہوں نے اپنے آپ کو چھُپانے کے لیے بھیس بدلا اور ایک راجا کے نوکروں میں شامل ہو گئے۔ کوروؤں کی نگاہیں برابر اُنہیں تلاش کر رہی تھیں، لیکن اُنہوں نے پورے ایک سال تک اپنی اصلیت ظاہر نہیں ہونے دی۔

جب تیرھواں سال بھی گُزر گیا تو پانڈوؤں نے شرط کے مطابق اپنی حکومت واپس مانگی۔ دھرت راشٹر اب بُوڑھا ہو چکا تھا۔ اُس کے بجائے دریو دھن راج

پاٹ کا مالک تھا۔ اُس نے پانڈوؤں کو ٹکا سا جواب دے دیا۔ اب پانڈوؤں کے لیے اِس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ طاقت کے بل پر اپنا حق حاصل کریں۔ پانڈو بارہ سال جنگلوں میں پھرتے رہے تھے، لیکن پنچال کا راجا دروپد اُن کا رشتے دار ہونے کے ناتے اُن کا حمایتی تھا۔ اِسی طرح اور بہت سے راجا تھے جو انہیں حق اور سچائی پر سمجھتے ہوئے اُن کا ساتھ دینے کے لیے تیّار تھے۔ اُنہوں نے اپنے حمایتی راجاؤں کی فوجوں کے بل بوتے پر کوروؤں کے ساتھ جنگ کرنے کی ٹھانی۔ اِس جنگ میں اور راجاؤں کے علاوہ یادیو خاندان کے راجا شِری کرشن کی حمایت حاصل تھی۔

جنگ سے پہلے کرشن جی نے کوروؤں کو سچّائی اور انصاف کے راستے پر چلنے کی دعوت دی مگر کوروؤں نے ہٹ دھرمی سے کام لیا اور اپنی ضِد پر اَڑے رہے، دونوں فوجیں کورو کشیتر کے میدان میں آ جمع ہوئیں۔ ارجُن پانڈو نے کوروؤں کی فوج پر نظر ڈالی تو اُس کا دِل ڈوبنے لگا۔ اِن فوجوں میں کُچھ ایسے لوگ بھی تھے جِن کے مُقابلے پر آنے کا وہ تصوّر بھی نہیں کر سکتا تھا۔ اِن میں وہ بھیشم بھی تھا

جس نے اپنے باپ راجا شانتنو کی خوشی کی خاطر ساری عُمر کنوارا رہنا قبول کر لیا تھا۔ اُسی نے پانڈو کی پرورش کی تھی اور اس کے مرنے کے بعد پانچوں پانڈو بھائیوں کو پال پوس کر پروان چڑھایا تھا۔ اُن میں وہ درون اچاریہ بھی تھا جو اُن کا اُستاد رہ چکا تھا اور اُنہوں نے جو کُچھ بھی سیکھا تھا، اُسی درون اچاریہ سے سیکھا تھا۔

کوروؤں اور پانڈوؤں کی فوجیں کروکشیتر کے میدان میں ایک دوسرے کے سامنے کھڑی تھیں۔ اُن میں آپس میں رشتہ داریاں تھیں، مگر دُشمنی نے اُن تمام رشتوں کو کاٹ ڈالا تھا۔ ارجُن نے تصوّر کی نگاہوں سے دیکھا کہ موت اُن کے سروں پر منڈلا رہی ہے۔ مال و دولت اور حکومت کے لالچ میں اپنے بھائی بندوں کے خُون سے ہاتھ رنگنا اُس کے نزدیک درست نہ تھا۔ یہ سوچ کر اُس نے جنگ کا اِرادہ ترک کر دیا۔

یہی وہ نازک وقت تھا جب کرشن جی نے اُس کی ڈھارس بندھائی اور اُسے سمجھایا کہ جب کوئی شخص سچّائی اور حق کی خاطر تلوار اُٹھاتا ہے تو اُسے اِس بات کی پرواہ

نہیں کرنی چاہئے کہ اُس کے مُقابلے میں کون ہے۔ مُقابلے میں اُس کا باپ ہو یا اُستاد، بیٹا ہو یا کوئی اور عزیز رشتے دار، اُسے صرف اُس سچّائی کا خیال ہونا چاہیئے جس کی خاطر اُس نے تلوار اُٹھائی ہے۔ کرشن جی کی ان باتوں نے ارجُن کے ڈانواں ڈول اِرادوں میں مضبوطی پیدا کر دی۔ وہ پورے حوصلے اور دلیری کے ساتھ میدانِ جنگ میں اُترا اور جب جنگ شروع ہوئی تو ارجُن اور اُس کے بھائیوں کے تیر دُشمن پر موت کی بارش برسانے لگے۔

اٹھارہ روز تک یہ جنگ جاری رہی۔ دھرت راشٹر کے تمام بیٹے اس لڑائی میں کام آئے۔ بھیشم اور درون اچاریہ بھی کوروؤں کی طرف سے لڑتے ہوئے مارے گئے، پانڈوؤں کو فتح نصیب ہوئی اور یُدھشٹِر پانڈو کو ہستناپور کا راجا تسلیم کر لیا گیا۔ اِس کے بعد پانڈو ایک مدّت تک بڑی شان سے حکومت کرتے رہے۔

مہا بھارت کی اِس جنگ کو کئی ہزار سال بیت چکے تھے، لیکن کروکشیتر کے میدان کو دیکھتے ہوئے یوں لگتا تھا جیسے یہ جنگ ابھی چند مہینے پہلے ہوئی ہے۔

اٹھارہ دِن کی اِس خوف ناک جنگ میں ہزاروں نہیں لاکھوں سورما کھیت رہے تھے۔ اُن کا خُون اِس میدان کی مٹّی میں جذب ہو گیا تھا، اور خون کی یہ لالی اب تک اِس مٹّی سے جھلکتی تھی۔

اس میدان کے ساتھ ہی وہ تالاب تھا جس کے کنارے بھیشم زخمی ہو کر ِگرا تھا اور تالاب اُس کے خون سے بھر گیا تھا۔ اُس تالاب کے کنارے اُس نے یُدھشٹِر پانڈو کو عقل اور دانائی کی بہت سی باتیں بتائی تھیں، اُسے حکومت کرنے کے طریقے سمجھائے تھے اور ہر اُس اُونچ نیچ سے آگاہ کیا تھا جو کسی راجا کو راج گدّی پر بیٹھنے کے بعد پیش آسکتی تھی۔

وہ کوروؤں کی حمایت میں اور پانڈوؤں کے خلاف لڑا تھا، لیکن جنگ کے بعد ایک سچّے سورما کی طرح اُس نے اپنے علم کی دولت کو یُدھشٹِر پانڈو کے سینے میں انڈیل دیا تھا۔ اپنے عُمر بھر کے تجربوں کا خزانہ یُدھشٹِر پانڈو کے حوالے کر دیا تھا۔

رام اور سیتا

ہم کورو کشیتر سے چلے اور اندر پرستھ پہنچے اور انہی کے بعد ہستنا پور گئے۔ یہ شہر پروار دا خاندان کے راجا ہستنا نے بسایا تھا اور اُسی کے نام سے ہستنا پور مشہور ہوا تھا۔ یہ کوروؤں کی راجدھانی تھی۔ اِس سے پہلے اندر پرستھ دیکھ آئے تھے۔ اب ہستنا پور دیکھا تو معلوم ہوا کہ دریودھن اور اُس کے بھائی پانڈوؤں کے دُشمن کیوں ہو گئے تھے۔ پانڈوؤں کا اندر پرستھ کوروؤں کے ہستنا پور کے مُقابلے میں کہیں زیادہ خوب صورت اور سات سُتھرا شہر تھا۔

ہستنا پور کے بعد ہم پنچال کے علاقے میں گئے۔ اب اگرچہ یہ علاقہ مگدھ کی سلطنت کا ایک حصّہ تھا لیکن کسی وقت یہ پانچ قبیلوں کی حکومتوں کے مجموعے کا نام تھا۔ شہر کمپیلا اُس کی راجدھانی تھا۔ اسی کمپیلا شہر کے شمال مشرق میں ایک وسیع اور ہموار میدان میں راجا دروپد نے اپنی بیٹی دروپدی کا سوئمبر رچایا تھا۔ پنچال کے علاقے سے ہوتے ہوئے ہم اجودھیا پُہنچے۔ یہ شہر ریاست کوشل کی راجدھانی تھا اور اِسے چندر بنسی خاندان کے راجا اکشواکو نے بسایا تھا۔ کاشی اور قنوج کے علاقے اِس ریاست میں شامل تھے۔ جب شیش ناگ خاندان کے پانچویں راجا بمبی سار نے کوشل کے راجا کی بیٹی سے شادی کی تھی تو کوشل کے راجا نے کاشی کا علاقہ جہیز میں اپنی بیٹی کو دے دیا تھا۔

جب ہم اجودھیا پہنچے تو وہاں دیوالی کا تہوار منایا جارہا تھا۔ یہ تہوار اُس واقعے کی یاد میں منایا جاتا ہے جب راجا رام چندر جی چودہ برس کا بَن باس کاٹ کر اور لنکا کے راجا راون پر فتح حاصل کرکے اجودھیا واپس آئے تھے۔

یہ کئی ہزار سال پہلے کی بات تھی۔ ایودھیا پر چندر بنسی راجا دسرتھ راج کرتا تھا۔ اُس کی تین رانیاں تھیں، کوشلیا، سمترا اور کیکئی۔ اِن رانیوں سے اُس کے چار لڑکے تھے۔ رام چندر، لکشمن، شترو گھن اور بھرت۔ رام چندر کی ماں کوشلیا، لکشمن اور شترو گھن کی ماں سمترا اور بھرت کی ماں کیکئی تھی۔ رام چندر سب بھائیوں سے بڑے تھے۔

رام چندر کی شادی متھرا کے راجا جَنک کی بیٹی سیتا سے ہوئی تھی۔ راجا جَنک نے اعلان کر رکھا تھا کہ جو نوجوان شِوجی کی کمان اُٹھا کر اُس سے تیر چلا دے گا۔ راج کُماری سیتا کی شادی اُس سے کر دی جائے گی۔ سوئمبر کے موقع سینکڑوں راجے اور راج کُمار آئے اور اُنھوں نے سوئمبر کی شرط پوری کرنے کی کوشش کی لیکن کمان اِتنی بھاری تھی کہ اُس سے تیر چلانا تو رہا ایک طرف، اُن میں سے کوئی شخص اُس کو اُٹھا بھی نہ سکا۔ پھر رام چندر جی آگے بڑھے اور اُنھوں نے کمان اُٹھا کر اُس کے دو ٹکڑے کر ڈالے۔ راجا جَنک نے انھیں سینے سے لگایا اور راج کُماری سیتا نے شادی کا ہار اُن کے گلے میں ڈال دیا۔ راجا دسرتھ کو جب اپنے بیٹے کی اِس کامیابی

کی خبر ملی تو وہ بہت خوش ہوا اور بڑی دھوم دھام سے چندر جی اور سیتا کو اجودھیا لے کر آیا۔ ساری ریاست میں بہت دِنوں تک خوشیاں منائی گئیں۔

راجا دسرتھ اب بُوڑھا ہو چکا تھا، اِس لیے چاہتا تھا کہ راج پاٹ کی ذمّہ داریوں سے سُبک دوش ہو کر زندگی کے باقی دِن خُدا کی عبادت میں بسر کرے۔ جب اُس نے اپنے درباریوں سے مشورہ کیا تو ہر ایک نے یہی رائے دی کہ رام چندر کو ولی عہد بنا دیا جائے۔ چنانچہ دربار میں ایک تقریب منائی گئی اور اُس میں دسرتھ نے اپنے بیٹے رام چندر جی کے ولی عہد ہونے کا اعلان کر دیا۔ اِس اعلان سے سب لوگ خوش تھے، مگر ایک ہستی ایسی بھی تھی جسے اِس اعلان سے خوشی کی جگہ دُکھ ہوا۔ یہ راجا دسرتھ کی چہیتی رانی کیکئی تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ دسرتھ کے بعد اُس کا اپنا بیٹا بھرت تخت کا وارث بنے۔ چنانچہ جیسے ہی راجا نے رام چندر جی کے ولی عہد ہونے کا اعلان کیا، اُس نے کھانا پینا چھوڑ دیا اور مُنہ ڈھانپ کر چارپائی پر لیٹ گئی۔

راجا دسرتھ نے کیکئی سے اُس پریشانی کی وجہ پُوچھی تو اُس نے راجا کو اُس کا ایک پُرانا وعدہ یاد دِلایا۔ کسی لڑائی میں راجا دسرتھ اور رانی کیکئی ایک ہی رَتھ میں بیٹھے تھے۔ لڑائی زوروں پر تھی۔ راجا اپنے دُشمنوں پر تیروں کا مینہ برسا رہا تھا۔ بیل رَتھ کو تیزی سے دوڑائے لیے جا رہے تھے کہ اچانک پہیّے کے دُھرے میں سے کِیل نکل گئی۔ قریب تھا کہ رَتھ اُلٹ جاتا کہ رانی کیکئی نے عقل مندی اور دلیری سے کام لے کر دُھرے میں کیل کی جگہ اپنی انگلی ڈال دی اور جب تک لڑائی ختم نہیں ہو گئی، اُس نے اپنی انگلی کو اُسی طرح کیل کے سوراخ میں ڈالے رکھا۔

لڑائی ختم ہونے پر جب راجا دسرتھ کو رانی کیکئی کی اِس بہادری کا علم ہوا تو اُس نے خوش ہو کر اُس سے کہا۔

"کیکئی! آج تیری عقل مندی اور بہادری کی وجہ سے میری جان بچی ہے اور میں نے اپنے دُشمن پر فتح پائی ہے۔ اب تو کوئی سی بھی دو خواہشیں کر سکتی ہے۔ میں

تُجھے قول دیتا ہوں کہ تیری دونوں خواہشیں پوری کروں گا؟

رانی کیکئی نے اُس وقت اپنی خواہشوں کا اظہار کرنے کے بجائے اُنہیں کسی مناسب موقع کے لیے اُٹھا رکھا۔ اور یہ مناسب موقع اب آیا تھا۔ رانی نے دسرتھ کو اُس کا وعدہ یاد دلاتے ہوئے کہا:

”مہاراج! کیا آپ اب بھی اپنے وعدے پر قائم ہیں؟“

راجا دسرتھ نے جواب دیا۔ ”وہ وعدہ مُجھ پر تیرا قرض ہے، جو تو جب چاہے وصول کر سکتی ہے۔“

اس پر رانی کیکئی نے کہا۔ ”تو سُنئے مہاراج! میری پہلی خواہش یہ ہے کہ رام چندر کو چودہ برس کے لیے جنگلوں میں بھیج دیا جائے اور میری دوسری خواہش یہ ہے کہ رام چندر کے بجائے میرے بیٹے بھرت کو ولی عہد مقرّر کیا جائے۔“

رانی کیکئی کے یہ الفاظ سُن کر راجا دسرتھ کے سینے میں تیر سا لگا۔ اُس نے کیکئی کی

طرف دیکھا لیکن کیکئی کی نظریں کہہ رہی تھیں کہ دُنیا اِدھر کی اُدھر ہو سکتی ہے، کیکئی کا ارادہ نہیں بدل سکتا۔ راجا دسرتھ نے اُسے طرح طرح سے سمجھایا، ہر طرح سے اُسے باز رکھنے کی کوشش کی لیکن کیکئی کی ضد کے آگے اُسے ہتھیار ڈالنے ہی پڑے۔ رام چندر جی کو جب اِس کی خبر ملی تو وہ اپنے باپ کے وعدے کی لاج رکھنے کے لیے چودہ برس کے بَن باس کے لیے تیّار ہو گئے۔ لکشمن کو خبر ہوئی تو وہ بغاوت پر آمادہ ہو گیا تاکہ باپ کو رانی کیکئی کی خوفناک خواہشات کو پورا کرنے سے باز رکھے، مگر رام چندر جی نے یہ کہہ کر اُس کے غصّے کو ٹھنڈا کیا کہ میں نے بَن باس اپنی خوشی سے قبول کیا ہے، اِس بارے میں کسی نے مُجھ پر کوئی سختی نہیں کی اور نہ اِس میں میرے باپ کا کوئی قصور ہے۔ اس پر لکشمن خود بھی رام چندر جی کے ساتھ بَن باس جانے کو تیار ہو گیا۔

رام چندر جی نے اپنی ماں کوشلیا کے پاؤں چھوئے اور ماں نے آنسوؤں بھری آنکھوں کے ساتھ اپنے بیٹے کو الوداع کہی۔ اِس کے بعد رام نے اپنی بیوی سیتا اور بھائی لکشمن کے ساتھ اجودھیا سے نکل کر جنگلوں کی راہ لی۔

وہ تینوں پہلے پریاگ پہنچے پھر بند ھیل کھنڈ سے ہوتے ہوئے جنوب کی طرف ہو لیے اور ڈنڈک کے مشہور جنگل میں جا پہنچے۔ اِسی جنگل میں ایک جگہ جھونپڑی ڈال کر جوگیوں کی طرح رہنے لگے۔

رام چندر جی سیتا اور لکشمن کو اجودھیا سے گئے زیادہ دِن نہ ہوئے تھے کہ راجا دسرتھ بیمار پڑ گیا۔ رام چندر جی اُسے اپنے بیٹوں میں سب سے زیادہ عزیز تھے اور قدرت نے اُس کے اِس پیارے بیٹے کو اُس سے جُدا کر دیا تھا۔ پھر اپنے پیارے بیٹے کے غم میں روتے ہوئے اُسے اُس شرون کی یاد آئی جس کے ماں باپ نے اُسے بد دُعا دی تھی۔

وہ دسرتھ کی جوانی کا زمانہ تھا اور اُسے شکار کا بے حد شوق تھا۔ وہ ایسا غضب کا تیر انداز تھا کہ رات کے اندھیرے میں جانور کو اپنے تیر کا نشانہ بنا لیتا تھا اور اُس کا نشانہ کبھی خطا نہ جاتا تھا۔

ایسے ہی ایک موقع پر وہ شکار کے لیے ایک جنگل میں پھر رہا تھا۔ رات ہو چکی

تھی۔ آسمان پر چاند بھی نہ تھا۔ راجا کے قریب ہی ایک دریا تھا اور دسرتھ کو آس تھی کہ جنگل کا کوئی نہ کوئی جانور اِس دریا میں پانی پینے آئے گا اور اِس طرح وہ جانور کا شکار کر سکے گا۔

وہ دریا کے قریب ایک درخت کی آڑ میں چھُپ کر بیٹھ رہا۔ اندھیرا اس قدر تھا کہ ہاتھ کو ہاتھ سُجھائی نہ دیتا تھا۔ کُچھ دیر بعد دریا کے کنارے آہٹ ہوئی اور پھر دسرتھ کو یوں لگا جیسے کوئی ہاتھی پانی پی رہا ہے۔ دسرتھ نے کمان میں تیر چڑھایا اور آواز کی طرف کا نشانہ لے کر چھوڑ دیا۔ تیر سن سے کمان سے نکلا اور اُس کے ساتھ ہی ایک چیخ سُنائی دی۔ مگر یہ چیخ کسی جنگلی جانور کی نہیں، کسی آدمی کی تھی۔

دسرتھ درخت کی اوٹ سے نکل کر دریا کے کنارے پہنچا تو ایک نوجوان کو تڑپتے پایا۔ قریب ہی ایک گھڑا پڑا تھا۔ وہ اِس گھڑے میں دریا سے پانی لینے آیا تھا کہ دسرتھ نے اُسے جنگلی جانور سمجھ کر اپنے تیر سے اُس کا جگر چھید دیا۔ یہ شردن تھا جو اپنے اندھے ماں باپ کو بہنگی میں بِٹھا کر مقدس مقامات کی یاترا کرانے نکلا تھا۔

بہنگی کندھے پر اُٹھائے اور اُس میں ایک طرف اپنی اندھی ماں اور دوسری طرف اپنے اندھے باپ کو بِٹھائے وہ انہیں ایک تیرتھ سے دوسرے تیرتھ اور دوسرے تیرتھ سے تیسرے تیرتھ یاترا کرواتا ہوا آگے جا رہا تھا کہ شام ہو جانے پر اِس جنگل کے پاس ٹھہر گیا۔ اور اب دریا سے اُن کے لیے پانی لینے آیا تھا، لیکن اُسے معلوم نہ تھا کہ دریا کے قریب دسرتھ کے روپ میں موت اُس کی راہ دیکھ رہی ہے۔

شرون نے دسرتھ کو اپنے ماں باپ کے بارے میں بتایا۔ اُسے غم تھا تو صرف یہ کہ اُس کے بعد اُس کے ماں باپ کی خدمت کون کرے گا۔ انہیں کھانا کون کھلائے گا۔ اُنہیں پانی کون پلائے گا؟ اُن کی بہنگی کون اُٹھائے گا؟ اُنہیں تیرتھوں کی یاترا کون کرائے گا؟

پھر اُس نے دیکھتے ہی دیکھتے دم توڑ دیا۔ دسرتھ نے پانی کا گھڑا لیا اور اُس کی جگہ جا پہنچا جہاں شردن کے اندھے ماں باپ ایک درخت کے نیچے بیٹھے اپنے بیٹے کا

انتظار کر رہے تھے۔

دسرتھ نے اُنہیں پانی پلایا لیکن زبان سے کوئی بات نہیں کی۔ وہ بار بار کہہ رہے تھے۔

”شردن بیٹے! تمہیں پانی لانے میں بہت دیر لگ گئی۔ کیا بات تھی؟“

”شردن! تُم ہماری آنکھیں ہو۔ تم ہمارے ہاتھ ہو۔ تم ہمارے پاؤں ہو۔ تم نہ ہوتے تو ہمیں کھانا کون کھلاتا۔ ہمیں پانی کون پلاتا۔ ہماری بہنگی کون اُٹھاتا۔ ہمیں تیرتھ یاترا کون کرتا؟“

شردن کے اندھے ماں باپ اِسی طرح کی باتیں کر کے اپنی محبّت کا اظہار کر رہے تھے لیکن دسرتھ خاموش تھا۔

اِس پر وہ چیخ اُٹھے۔ ”شردن! تُم خاموش کیوں ہو؟ بولتے کیوں نہیں؟ تمہیں کیا ہو گیا ہے؟ پہلے تو تم ایسے نہیں تھے۔ ہم ایک بار بُلاتے تھے تو تُم سو بار بولتے

تھے۔ پھر آج کیا ہو گیا ہے؟ تمہیں چُپ کیوں لگ گئی ہے؟"

یہ کہہ کر اُنہوں نے دسرتھ کو کندھوں سے پکڑ کر جھنجھوڑ ڈالا اور پھر حیرانی سے چیخ اُٹھے۔

"شرون! نہیں، تم ہمارے شرون نہیں ہو۔ کون ہو تم؟ بولو جواب دو! ہمارا شرون کہاں ہے؟"

اِس پر دسرتھ نے بھرّائی ہوئی آواز میں اُنہیں سارا ماجرا کہہ سُنایا۔ شرون کے اندھے ماں باپ نے بڑے صبر اور حوصلے کے ساتھ اپنے بیٹے کے مارے جانے کی داستان خود اُس کے قاتل کی زبانی سُنی اور جب راجا دسرتھ بات ختم کر کے خاموش ہوا تو وہ کہنے لگے۔

"کوشل کے راجا! پرجا پر ظُلم ہوتا ہے تو وہ ظُلم کرنے والے کی شکایت لے کر راجا کے پاس جاتی ہے۔ لیکن ظُلم کرنے والا خود راجا ہو تو پرجا شکایت کرنے کس کے پاس جائے؟ تو راجا ہے۔ تُجھ پر ہمارا کوئی زور نہیں۔ ہم تُجھے نہیں دیکھتے لیکن وہ

ضرور دیکھتا ہے جس نے ہمیں اور تُجھے پیدا کیا ہے۔ جا! جس طرح تُو نے ہمیں بیٹے کا دُکھ دیا ہے، اِسی طرح تو بھی بیٹے کا دُکھ سہے۔“

یہ تھی وہ بد دُعا جو شرون کے اندھے ماں باپ نے دسرتھ کو دی تھی اور اِس کا نتیجہ اب سامنے آیا تھا جب بڑھاپے میں اپنے پیارے بیٹے کی جُدائی میں بے حال ہر کر بستر سے لگ گیا تھا۔

راجا دسرتھ اپنے پیارے بیٹے کا دُکھ زیادہ دِنوں تک نہ جھیل سکا اور یہ غم جلد ہی اُسے موت کی آغوش میں لے گیا۔ بھرت اِس وقت اپنے نانا کے پاس گیا ہوا تھا۔ باپ کے مر جانے کی خبر پا کر وہ اجودھیا واپس آیا اور یہیں اُسے یہ معلوم ہوا کہ اُس کی ماں کی ضِد کی وجہ سے اُس کا بڑا بھائی چودہ سال کے لیے بَن باس لینے پر مجبور ہوا ہے۔

بھرت کو اپنی ماں پر بہت غصّہ آیا۔ اُس کی ماں نے تو یہ سب کُچھ اِس لیے کیا تھا کہ دسرتھ کے بعد اجودھیا کی راج گدّی پر بھرت بیٹھے، لیکن بھرت اپنے باپ

کی گدّی پر بیٹھنے کے بجائے اجودھیا کے چند بزرگوں کو ساتھ لے کر اپنے بڑے بھائی کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا اور بستی بستی، جنگل جنگل ڈھونڈتے ہوئے ڈنڈل کے اُس جنگل میں جا پہنچا جہاں رام چندر جی، سیتا اور لکشمن ایک کُٹیا میں فقیروں کی طرح رہ رہے تھے۔

بھرت نے رام چندر جی سے درخواست کی کہ وہ چل کر کوشل کی حکومت کو سنبھال لیں، لیکن اُنہوں نے انکار کر دیا۔ وہ باپ کے وعدے کو ہر حال میں نِبھانا چاہتا تھا۔ بھرت اور اُس کے ساتھی ناکام واپس آ گئے۔ بھرت واپس اجودھیا آ تو گیا لیکن اُس نے شاہی تخت پہ قدم نہیں رکھا۔ اُس نے خود تخت پر بیٹھنے کے بجائے اپنے بڑے بھائی کے جُوتے تخت پر رکھ دیے۔ اِس سے دُنیا کو یہ بتانا تھا کہ حکومت کا اصل حق دار بھرت نہیں رام چندر جی ہیں۔ اِس کے بعد اُس نے رام چندر جی کے نام پر حکومت کی باگ ڈور سنبھالی اور اُس وقت تک حکومت کرتا رہا جب تک رام، سیتا اور لکشمن چودہ سال کا بَن باس کاٹ کر اجودھیا واپس نہیں آ گئے۔

ڈنڈک کے جنگلوں میں رام چندر جی،سیتا اور لکشمن کو طرح طرح کی تکلیفوں کا سامنا کرنا پڑا، اِن ہی جنگوں میں ایک روز اُن کی ملاقات راج کُماری سروپ نکھا سے ہوئی جو لنکا کے راجا راون کی بہن تھی۔ اُس کا دوسرا بھائی کھارا دیو بھی ایک زبردست راجا تھا۔

راج کُماری سروپ نکھا نے رام چندر جی کو دیکھا تو اُس نے اُن سے شادی کی خواہش ظاہر کی۔ رام چندر جی نے سروپ نکھا کی باتوں پر کوئی توجّہ نہ دی، لیکن وہ اُن کے پیچھے پڑی رہی۔ اِس پر لکشمن کو طیش آگیا اور اُس نے سروپ نکھا کی ناک کاٹ ڈالی۔

سروپ نکھا سیدھی اپنے بھائی کھارا دیو کے پاس پہنچی اور اسے بہن کی بے عزّتی کا بدلہ لینے پر اُکسایا۔ کھارا دیو نے رام چند جی پر حملہ کیا لیکن رام اور لکشمن کے تیروں کی بوچھاڑ نے کھارا دیو اور اُس کے تمام ساتھیوں کو ختم کر ڈالا۔

کھارا دیو کی اس شکست نے سروپ نکھا کے غصّے کی آگ پر تیل کا سا کام کیا۔ وہ

اپنے دوسرے بھائی راون کے پاس پہنچی، جو لنکا کا راجا تھا۔ وہ طاقتور ہونے کے علاوہ ہوشیاری اور چالاکی میں بھی جواب نہ رکھتا تھا۔ اُس نے اپنی بہن کی بے عزّتی کا بدلہ یوں لیا کہ رام اور لکشمن کی غیر حاضری میں سیتا کو اُٹھا لایا اور اُنہیں اپنے محل کے ایک باغ میں قید کر دیا۔

رام اور لکشمن اُس وقت شکار کے لیے گئے ہوئے تھے۔ واپس آئے تو سیتا کو غائب پایا۔ وہ اُس کی تلاش میں نکلے۔ سیتا کی تلاش میں جگہ بہ جگہ پھرتے ہوئے جب وہ راجا سرجیوا کی ریاست میں پہنچے تو وہاں ایک مقام پر اُنہیں سیتا کے کپڑے اور زیور ملے جو سیتا نے اِس لیے پھینک دیے تھے کہ اُن سے اُس کا سُراغ مل سکے۔ اِن کپڑوں اور زیوروں سے اور کُچھ دوسری باتوں سے آخر کار اُنہیں یہ معلوم ہو گیا کہ سیتا کو لنکا کا راجا راون اُٹھا لے گیا ہے اور اُس نے اِس طرح اپنی بہن سروپ نکھا کی بے عزّتی کا بدلہ لینے کی کوشش کی۔

راجا سرجیوا نے رام چندر جی اور لکشمن کو بڑی عزّت سے اپنے ہاں ٹھہرایا۔ بیمار کو

بیمار سے ہمدردی ہوتی ہے۔ زخمی کو زخمی کا درد ہوتا ہے۔ سر جیوا کے ساتھ بھی ایسا ہی واقعہ ہو چُکا تھا جو رام چندر جی کو پیش آیا تھا۔ پڑوس کا ایک راجا سر جیوا کی رانی کو اُٹھا لے گیا تھا اور اُس نے اُسے اپنے ہاں قید کر رکھا تھا۔ راجا سر جیوا باوجود کوششوں کے ابھی تک اپنی رانی کو واپس نہ لے سکا تھا۔

رام چندر جی اور راجا سر جیوا دونوں ایک ہی قسم کی مُصیبت میں مُبتلا تھے۔ اُنھوں نے عہد کیا کہ وہ ایک دوسرے کا ساتھ دیں گے۔ چنانچہ راجا سر جیوا نے رام چندر اور لکشمن کی مدد سے اپنے دُشمن پر حملہ کیا اور اُسے موت کے گھاٹ اُتار کر اپنی رانی کو دوبارہ حاصل کر لیا۔ اِس طرح رام اور لکشمن کے سہارے اُسے ایسی کامیابی نصیب ہوئی جس کا وہ تصوّر بھی نہیں کر سکتا تھا۔

راجا سر جیوا کو یہ کامیابی رام چندر اور لکشمن کی بدولت حاصل ہوئی تھی، چنانچہ اُس نے اپنی تمام فوجوں کو رام اور لکشن کے حوالے کر دیا تا کہ وہ لنکا پر چڑھائی کر کے سیتا کو حاصل کر سکیں۔ اِن فوجوں کا سپہ سالار ہنومان تھا۔

رام اور لکشمن ہنومان اور اُس کی فوج کو ساتھ لے کر لنکا کی طرف روانہ ہوئے۔ ہنومان نے یہ تدبیر کی کہ خُفیہ طور پر لنکا جا پہنچا اور پھر واپس آکر رام اور لکشمن کو لنکا کے حالات سے آگاہ کیا۔

رام اور لکشمن کا یہ لشکر لنکا کی طرف بڑھا تو سامنے سمندر دیکھ کر اُنہیں رُک جانا پڑا۔ یہاں ہنومان اور اُس کی فوج کام آئی۔ اُس نے سمندر کے اوپر، لنکا کے ساحل تک ایک پُل بنا دیا۔ اِس کے بعد وہ سب لنکا کے ساحل پہ جا اُترے۔

راون کو رام چندر جی کے اِرادوں کی خبر بہت پہلے مل چُکی تھی اور وہ مُقابلے کے لیے پوری طرح تیّار تھا۔ جیسے ہی رام اور لکشمن ہنومان اور اُس کے لشکر کے ساتھ لنکا پہنچے، راون اپنی فوجوں کے ساتھ میدان میں آ گیا۔

دونوں فوجوں میں گھمسان کا رن پڑا۔ راون نے اگرچہ پوری تیّاریاں کر رکھی تھیں، لیکن وہ رام اور لکشمن کے مُقابلے میں نہ ٹھہر سکا۔ ہنومان کے پھُرتیلے سپاہی اُس کی فوج کو گاجر مولی کی طرح کاٹ رہے تھے اور مرنے والوں کے خون

سے لنکا کی دھرتی سُرخ ہوئی جا رہی تھی۔ اِس لڑائی میں راون کے بہت سے رشتہ دار مارے گئے۔ اُن میں اُس کا بھائی کُمبھ کرن اور اُس کا اپنا بیٹا میگھ ناد بھی تھا۔ اُن کے بعد راون خود رام چندر جی کے مُقابلے پر آیا، اور اُن دونوں میں وہ لڑائی ہوئی جس میں زور کا مُقابلہ زور سے اور عقل مندی کا مُقابلہ عقل مندی سے تھا، مگر آخر رام چندر جی غالب آئے اور اُنہوں نے راون کو موت کے گھاٹ اُتار دیا۔

راون کو موت کے گھاٹ اُتارنے کے بعد رام اور لکشمن نے سیتا کو اُس باغ سے نکالا جہاں راون نے انہیں قید کر رکھا تھا۔ اِس کے بعد اُنہوں نے راون کے ایک نیک دل بھائی بھبھیشن کو لنکا کی راج گدّی پر بٹھایا۔ پھر اُنہوں نے لنکا کی فتح کی خوشی میں ایک جشن منایا۔ یہی وہ جشن تھا جس کی یاد میں دسہرا کا تہوار منایا جاتا ہے۔

اس جشن کے ساتھ ہی رام چندر کے بَن باس کے چودہ برس پورے ہو گئے اور وہ

نہایت شان و شوکت کے ساتھ اجودھیا واپس آئے۔ اُن کی واپسی کی خوشی میں لوگوں نے گھر گھر چراغ جلائے اور اِس طرح اپنی خوشی کا اظہار کیا۔ اُن کی اِس خوشی نے بعد میں دیوالی کے تہوار کی شکل اختیّار کی۔ دسہرا وہ دِن تھا جب رام چندر نے راون پہ فتح پائی تھی، اور دیوالی وہ دِن تھا جب وہ اجودھیا واپس آئے تھے۔

بھرت نے حکومت رام چندر جی کے حوالے کر دی اور خود ایک فرماں بردار بھائی کی طرح اُن کے ماتحت زندگی بسر کرنے لگا۔

یہ کئی ہزار سال پہلے کی بات تھی۔ اب نہ کوشل کی ریاست تھی اور نہ اکشواکو خاندان کے چندر بنسی راجا۔ اب یہ سارا علاقہ دوسرے علاقوں کی طرح مگدھ کے راجا سدھانند کی سلطنت میں شامل تھا اور یہ سلطنت مشرق میں سمندر کے پانیوں سے لے کر مغرب میں دریائے ستلج کے کناروں تک پھیلی ہوئی تھی۔

مگر دسہرے اور دیوالی کی صورت میں چندر بنسی راجا دسرتھ کے بیٹے راجا رام

چندر جی کی یاد اب بھی تازہ تھی۔ لوگ اب بھی راجا رام چندر جی کی داستان سُنتے تھے اور کہتے تھے:

بیٹا ہو تو رام چندر جیسا فرماں بردار،

بیوی ہو تو سیتا جیسی وفادار،

اور بھائی ہو تو لکشمن اور بھرت جیسا خدمت گزار!

کپل وستو کا راج کُمار

اجودھیا کی یاترا کے بعد ہم آگے چلے اور متھرا پہنچے۔ یہ وہ شہر تھا جہاں کے راجا جَنک نے اپنی بیٹی سیتا کی شادی کے لیے سوئمبر رچایا تھا اور یہ شرط رکھی تھی کہ جو شخص شِو جی مہاراج کی کمان اُٹھا کر اُس سے تیر چلا دے گا، سیتا کی شادی اُسی سے ہو گی۔ سب راجے اور راج کُمار اِس شرط کو پورا کرنے میں ناکام رہے تھے مگر راجا دسرتھ کے بیٹے رام چندر جی نے اِس بھاری کمان کو اُٹھا کر دو ٹکڑے کر دیا تھا اور یوں سوئمبر کی شرط پوری کر کے سیتا کو حاصل کر لیا تھا۔

متھرا سے چل کر ہم پریاگ پہنچے (اب اس کا نام الہ آباد ہے اور یہ بھارت کے صُوبے اُتر پر دیش کا ایک شہر ہے)۔ یہ وہ جگہ تھی جس نے پانڈوؤں اور رام چندر جی دونوں کے قدم دیکھے تھے۔ جب رام چندر جی نے اپنے باپ کے رانی کیکئی سے کیے ہوئے وعدے کی لاج رکھنے کے لیے چودہ برس کا بَن باس لیا تھا تو وہ لکشمن اور سیتا کے ساتھ اجودھیا سے نکل کر پریاگ پہنچے تھے اور یہاں سے اُنھوں نے جنوب کا رُخ کیا تھا۔

جب پانڈوؤں کو ہستناپور چھوڑ دینے کا حکم ملا تھا تو وہ بھی راستے میں طرح طرح کی تکلیفیں اُٹھاتے ہوئے پریاگ پہنچ گئے تھے۔ یہیں دھرت راشٹر کا بڑا بیٹا دریو دھن اُن کے پاس آیا تھا۔ اُن سے اپنے پہلے سلوک کی معافی مانگی تھی اور پھر اُنھیں بہلا پھُسلا کر واپس ہستناپور کی طرف لے گیا تھا۔ پھر راستے میں اُنھیں ایک ایسے مکان میں ٹھہرایا تھا جس کی دیواروں پر لاکھ کا روشن کیا گیا تھا۔ دریودھن نے رات کے وقت تمام دروازے بند کر کے اِس مکان کو آگ لگادی تھی۔ اُس کا خیال تھا کہ اِس طرح پانچوں پانڈو بھائی آگ میں جل کر بھسم ہو جائیں گے،

لیکن وہ فرش کے نیچے سے ایک سُرنگ لگا کر بچ نکلنے میں کامیاب ہو گئے تھے۔

متھرا سے چل کر ہم گیا پہنچے۔ اِس شہر میں برگد کا وہ درخت اب تک موجود تھا جِس کے نیچے بیٹھ کر کپل وستو کے راج کُمار ساکیا منی گوتم بُدھ کو گیان (خُدا کی حقیقت کا عِلم) حاصل ہوا تھا اور پھر اُس نے بستی بستی شہر شہر گھومتے ہوئے ذات پات اور رسم ورواج کے بندھنوں میں جکڑے ہوئے انسانوں کو نجات کی نئ راہ دِکھائی تھی اور دُکھی انسانیت پر اُمّید کی نئ دُنیا کے دروازے کھولے تھے۔

یہ اُس وقت کی بات تھی جب مگدھ کی ریاست پر شیش ناگ خاندان کا پانچواں راجا بمبی سار راج کر رہا تھا۔ پاٹلی پُتر کا اُس وقت تک کوئی وجود نہ تھا اور مگدھ کی راجدھانی راج گڑھ کے شہر میں تھی۔

مگدھ کے شمال کی طرف، ہمالہ کی مغربی ترائی میں، ساکیا قبیلے کی ایک چھوٹی سی پہاڑی ریاست تھی۔ راجا شدھودھن اِس ریاست پر راج کرتا تھا اور کپل دستو اُس کی راجدھانی تھا۔ اُس کی رانی کا نام مہامایا تھا جو ایک پڑوسی ریاست کولیہ کے

راجا اَنجن کی بیٹی تھی۔

شدھودھن اور مہامایا کی شادی یوں تو چھوٹی عمر ہی میں ہو گئی تھی مگر ایک عرصے تک اُن کے ہاں اولاد نہ ہوئی۔ آخر جب راجا شدھودھن کی عمر پینتالیس برس کو پہنچی تو بڑی منّتوں مُرادوں کے بعد ایک لڑکا پیدا ہوا جس کا نام سِدھارتھ رکھا گیا۔ اُس کی پیدائش کے سات دِن بعد ہی مہامایا اِس دُنیا سے چل بسی۔ ماں کے مرنے کے بعد سِدھارتھ نے مہامایا کی چھوٹی بہن پراج پتی گوتمی کی گود میں پرورش پائی۔ اِسی نسبت سے اُس نے آگے چل کر گوتم کا نام پایا جو ایک طرح سے اُس کا خاندانی نام بھی تھا۔

راج کُمار گوتم ذرا بڑا ہوا تو اُسے تعلیم و تربیت کے لیے بہترین اُستادوں کے سپرد کیا گیا۔ اُس کا سب سے پہلا اُستاد وشوامتر تھا جو اُسے لکھنا پڑھنا سکھانے کے لیے مقرّر ہُوا تھا۔ وشوامتر کے بعد اُس وقت کا ایک مانا ہوا عالم فاضل شخص سوبھامتر آٹھ دوسرے اُستادوں کے ساتھ گوتم کا نگران اور اُستاد مقرّر ہوا۔

راج کُمار گوتم شروع ہی سے بڑا ذہین تھا۔ اُستاد جو کُچھ اُسے بتاتے، اُسے فوراً یاد ہو جاتا۔ اپنی اِسی خوبی کی وجہ سے اُس نے بہت چھوٹی عُمر میں اُس وقت کے تمام علم سیکھ لیے تھے۔

اس کے ساتھ ہی گوتم نے وہ تمام جنگی ہُنر بھی سیکھے جو ایک راج کُمار کے لیے ضروری تھے۔ جلد ہی راج کُمار گوتم اِن ہُنروں میں بھی ایسا طاق ہو گیا کہ ارجن پانڈو کی طرح اس کی بہادری کے چرچے دور دور تک ہونے لگے۔ رَتھوں کی دوڑ میں بڑے سے بڑا ماہر رَتھ بان بھی اُس سے بازی نہ لے جا سکتا۔ گھوڑا دوڑنے میں کوئی اُس سے نہ بڑھ سکتا تھا۔ نیزہ پھینکنے اور بھاری سے بھاری کمان سے تیر چلانے میں کوئی اس کے پاسنگ بھی نہ تھا، تلوار چلانے میں تو بڑے سے بڑا سورما اُس کے سامنے نہ ٹھہر سکتا تھا۔

راج کُمار گوتم کو شروع ہی سے سوچ بچار کی عادت تھی۔ وہ جو کچھ بھی دیکھتا تھا اُس کا سبب جاننے کی کوشش کرتا تھا۔ جیسے جیسے اُس کی عُمر بڑھتی گئی، اُس کی

سوچ بچار کی عادت بھی بڑھتی گئی۔ وہ ہر وقت کسی فکر میں کھویا کھویا نظر آتا تھا۔ اکثر ایسا ہوتا تھا کہ وہ شہر کے شور غُل سے بچ کر کسی ایسی جگہ چلا جاتا جہاں اُسے تنہائی مل سکتی اور وہ وہاں اکیلے بیٹھ کر پہروں سوچتا رہتا۔ وہ اپنے خیالوں میں کچھ اِس طرح کھو جاتا تھا کہ نوکروں کے پُکارنے پر بھی نہ بولتا۔ راج محل کے آرام سے زیادہ اُسے جنگل کی تنہائی اور اِس تنہائی میں سوچ بچار کرنا پسند تھا۔

راجا شدھودھن اپنے بیٹے کے طور طریقوں سے بہت پریشان تھا۔ وہ تو اُسے اِس قابل بنانا چاہتا تھا کہ اُس کے مرنے کے بعد راج گدّی کو سنبھال سکے، مگر گوتم کے طریقوں سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ اُسے راج پاٹ کی نسبت ایک کونے میں بیٹھ کر سوچ بچار کرنا زیادہ اچھا لگتا ہے۔ راج کُمار گوتم کا یہ حال دیکھ کر شدھودھن نے عقل مند لوگوں سے مشورہ کیا تو انہوں نے راجا کو رائے دی کہ گوتم کی شادی کر دینی چاہیے۔ شادی ہو جائے گی تو وہ اپنے آپ ہی دُنیا دار بن جائے گا اور راج پاٹ کا کام سنبھالنے کی فکر کرے گا۔ راجا شدھودھن کو یہ تجویز پسند آئی اور اُس نے گوتم کی شادی گوتم کے ننہالی رشتے دار سپرا بادھو کی بیٹی میشودھرا

کے ساتھ کر دی۔ اُس وقت گوتم کی عمر اٹھّارہ انیس برس تھی۔

راجا شدھودھن نے اپنے بیٹے کے رہنے کے لیے تین محل بنوائے تھے۔ ایک گرمی کے موسم کے لیے تھا، دوسرا سردی کے موسم کے لیے اور تیسرا بہار کے موسم کے لیے۔ گوتم اِن شان دار محلوں میں بڑے آرام کی زندگی بسر کرتا تھا مگر اِس کے باوجود اُس کی آنکھوں میں ہر وقت اُداسی سی رہتی تھی۔ گوتم کی شادی میشودھرا سے ہو گئی تو راجا شدھودھن نے ایسا انتظام کر دیا کہ اُن دونوں کو سوائے آرام اور عیش کے اور کوئی کام نہ ہو۔

گوتم ایک نہ دو پُورے دس برس اپنے محل میں عیش اور آرام کی زندگی بسر کرتا رہا مگر اِس تمام عیش اور آرام کے باوجود وہ برابر اِس سوچ میں کھویا رہتا تھا کہ اِس دُنیا میں انسان کس طرح سُکھی رہ سکتا ہے۔

راجا شدھودھن نے اِس بات کی پوری پوری کوشش کی تھی کہ گوتم کے سامنے کوئی ایسا شخص یا چیز نہ آنے پائے جو اُسے اداس کر دے، یا جسے دیکھ کر اُس کے

دِل کو تکلیف پہنچے۔ شدھودھن کی اِس احتیاط کے باوجود گوتم جان چُکا تھا کہ زندگی انسانوں ہی کے لیے نہیں، کیڑے مکوڑوں تک کے لیے عذاب ہے۔ چیونٹی کو سانپ کھا جاتا ہے، سانپ کو نیولا اور چیل اُن دونوں کو اپنی خوراک بنا لیتی ہے۔ بڑی مچھلی چھوٹی مچھلی کو نِگل لیتی ہے مگر شِکرا بڑی مچلی کو چونچ میں دبا کر لے اُڑتا ہے۔ پرندے تتلیوں کو کھا جاتے ہیں اور یہ پرندے بڑے شکاری پرندوں کا لُقمہ بن جاتے ہیں۔

دس برس تک اپنے محل میں عیش اور آرام کی زندگی گزارنے پر بھی گوتم کی اُداسی دور نہیں ہوئی تھی۔ جس چیز کی اُسے تلاش تھی، وہ اُسے راج محل کی عیش بھری زندگی میں نظر نہ آئی تھی۔ آخر وہ اِس نتیجے پر پہنچا کہ اگر وہ چیز اِس دُنیا میں کہیں موجود ہے، تو راج محل سے باہر کی زندگی میں ملے گی۔ یہ سوچ کر اُس نے راج محل سے باہر کی دُنیا دیکھنے کا فیصلہ کیا۔

راجا شدھودھن کو گوتم کی اِس خواہش کا علم ہوا تو اُس نے اعلان کرا دیا کہ

سارے شہر کو صاف ستھرا کر کے اچھّی طرح سجایا جائے۔ اِس کے ساتھ ہی اُس نے یہ بھی حکم دیا کہ جب راج کُمار گوتم کی سواری نکلے تو کوئی بُوڑھا، بیمار، اندھا، لولا یا لنگڑا سڑک پر نہ پھِر رہا ہو۔

راجا نے یہ احتیاط صرف اِس لیے کی تھی کہ وہ اپنے بیٹے کو دُکھ اور تکلیف کی ہوا بھی لگنے نہیں دینا چاہتا تھا۔ مگر اِس تمام احتیاط کے باوجود جب گوتم سیر کے لیے نکلا تو تقدیر کا اِن دیکھا ہاتھ ایک ایسے بُوڑھے کو اُس کے سامنے لے آیا جسے بڑھاپے نے اَدھ مُوا کر رکھا تھا۔ وہ بہت دُبلا اور کمزور ہو گیا تھا۔ اُس کے جسم کی کھال جگہ جگہ سے چُرمرائی ہوئی تھی۔ کمر دوہری ہو چکی تھی، آنکھوں سے کُچھ سوجھتا نہ تھا، اور اُس نے ایک لاٹھی سے اپنے ہلتے ڈگمگاتے جسم کو سہارا دے رکھا تھا۔ اُس کا دوسرا ہاتھ اُس کی پسلیوں پہ تھا جو اُس کے زور زور سے ہانپنے کی وجہ سے بُری طرح ہل رہی تھیں۔

پھر گوتم نے ایک ایسے آدمی کو دیکھا جسے بیماری نے بے حال کر رکھا تھا۔ اُس کی

حالت اِس قدر خراب تھی کہ وہ کوئی دم کا مہمان نظر آتا تھا۔ وہ زندہ تھا لیکن اُس کی زندگی مُردوں سے بدتر تھی۔ پھر گوتم نے ایک لاش دیکھی جیسے لوگ جلانے کے لیے مرگھٹ لے جا رہے تھے۔ مرنے والے کے رشتے دار مرد عورتیں اور بچّے بین کرتے، چھاتی پیٹتے اور روتے دھوتے۔ لاش کے ساتھ ساتھ جا رہے تھے۔ اُن کے چہرے غم اور دُکھ کی تصویر بنے ہوئے تھے۔

گوتم نے راج محل سے باہر نکل کر بڑھاپا، بیماری اور موت کی صورت میں زندگی کی وہ تصویریں دیکھی تھیں جو دُکھ اور غم کے سوا اور کُچھ نہ تھیں۔ وہ جان گیا تھا کہ انسان گی زندگی اس کے لیے دُکھ ہی دکھ ہے اور تکلیف ہی تکلیف ہے۔ اب اُسے معلوم ہو گیا تھا کہ دُنیا دُکھوں کا گھر ہے۔ لیکن وہ جاننا چاہتا تھا کہ انسان کا دُکھ کیسے سُکھ میں بدل سکتا ہے؟ اُسے دُنیا کی تکلیفوں اور غموں سے نجات کیسے مل سکتی ہے؟

آخر اُس نے دُنیا کو چھوڑ دینے کا فیصلہ کر لیا اور ٹھیک اُس رات جب کہ اُس کا بیٹا

راہول پیدا ہوا تھا اُس نے راج محل کے عیش اور آرام پر لات ماری اور اپنی بیوی اور بچّے پر الوداعی نظر ڈالتے ہوئے محل سے رُخصت ہو گیا۔ اُس وقت اُس کی عُمر اُٹھتیس برس تھی۔

گوتم سے پہلے کتنے ہی لوگ دُنیا سے مُنہ موڑ کر فقیر اور جوگی بن گئے تھے مگر گوتم کے دُنیا سے مُنہ موڑ لینے میں ایک شان تھی۔ اُس نے دُنیا اور اُس کے عیش اور آرام سے اُس وقت مُنہ موڑا جب وہ جوان تھا، بُوڑھا یا اُدھیڑ عُمر کا نہیں تھا۔ اُس نے دُنیا کو اُس وقت ٹھکرایا جب یہ دُنیا اُس کے اِشاروں پر چلنے کو تیّار تھی۔

گوتم نے انومہ ندی کے کنارے پہنچ کر اپنا شاہی لباس اُتار دیا، سر کے لمبے لمبے بال تلوار سے کاٹ کر پھینک دیے اور جوگیوں کا سا لباس پہن کر بھیک کا پیالہ ہاتھ میں لے لیا۔ یوں وہ باپ، بیوی، بچّے، امیروں، وزیروں اور پرجا کو روتا دھوتا چھوڑ کر سنیاسی بن گیا۔

انومہ ندی کے کنارے سات دِن گُزارنے کے بعد گوتم ایک بہت بڑے سنیاسی

آلار کلامہ کے پاس پہنچا اور اُس سے عِلم حاصل کرنے لگا۔ آلار کامہ اپنے وقت کا مانا ہوا عالم تھا اور اُس کے چیلوں کی تعداد سینکڑوں ایک پہنچتی تھی۔

گوتم نے چند ہی دِنوں میں وہ سارا عِلم حاصل کر لیا جو آلار کلامہ نے اُس وقت تک سیکھا تھا، مگر اِس سے بھی اُس کے دِل کو تسلّی نہ ہوئی۔ آخر مجبور ہو کر ایک اور عالم اُواکہ کے پاس پہنچا۔ اُواکہ نجات کے لیے تپسیا (جسمانی ریاضت) کو ضروری سمجھتا تھا۔ گوتم نے اس علم کو بھی چند دِن کے اندر اندر حاصل کر لیا مگر اِس سے بھی اُس کی تسلّی نہ ہوئی۔

اُلار کلامہ اور اُواکہ سے عِلم حاصل کرنے کے بعد گوتم کے دِل میں یہ خیال پیدا ہوا تھا کہ سچّی اور ہمیشہ رہنے والی خوشی کے لیے دِل اور جسم دونوں کو مارنا ضروری ہے۔ اِس سے خواہشات بالکل ہی ختم ہو جائیں گی۔

یہ سوچ کر گوتم نے اوردویلہ کے جنگلوں کا رُخ کیا اور وہاں ایک چھوٹی سی ندی کے کنارے ڈیرا ڈال کر کوئی چھ برس سخت قسم کی جسمانی ریاضت کی۔ پہلے کئی

کئی روز تک سانس روکے رکھنے کی مشق کی۔ پھر خوراک کم کرتے کرتے بالکل ہی گھٹا دی۔ کبھی ایک تِل کبھی ایک بیر اور کبھی ایک چاول ہی کھا کر گزارہ کیا اور کبھی کئی کئی دِنوں تک کُچھ بھی نہ کھایا۔

اِس ریاضت سے گوتم کی جسمانی حالت کُچھ سے کُچھ ہو گئی۔ خوب صورت جسم سوکھ کر کانٹا ہو گیا۔ آنکھیں اندر کو دھنس گئیں، ہڈّیاں نکل آئیں۔ دیکھنے والا یقین ہی نہ کر سکتا تھا کہ یہی وہ سِدھارتھ ہے جو کبھی کپل وستو کا راج کُمار ہوا کرتا تھا۔

شروع شروع میں گوتم کا خیال تھا کہ سخت ریاضتوں سے اپنے جسم کو دُکھ دینے کے بعد اُسے گیان حاصل ہو جائے گا اور اُسے انسان کی نِجات کا راز معلوم ہو جائے گا، مگر وہ اِن ساری ریاضتوں کے باوجود اُس کے دِل کی بے چینی اُسی طرح رہی، اور تب اُس کے دِل میں یہ خیال آیا کہ کامیابی حاصل کرنے کے لیے زندہ رہنا ضروری ہے اور زندہ رہنے کے لیے جسم کی حفاظت کرنا لازمی ہے۔ اِس کے

بعد گوتم نے ریاضت اور تپسیا چھوڑ کر باقاعدگی سے خوراک کھانی شروع کر دی اور اِس طرح آہستہ آہستہ اُس کے جسم میں کُچھ توانائی آنی شروع ہو گئی۔

اتنی ساری تکلیفیں اُٹھانے کے بعد گوتم اِس نتیجے پر پہنچا تھا کہ صرف دُنیا ترک کر کے کوئی انسان دُکھوں اور تکلیفوں سے نجات حاصل نہیں کر سکتا اور جسم کو طرح طرح کے دُکھ اور تکلیفیں دینے سے بھی گیان حاصل نہیں ہو سکتا۔ اِس کے بعد گوتم نے دھیان کے ذریعے گیان حاصل کرنے کا فیصلہ کیا۔

گوتم جب پِھرتا پھراتا گیا کے قریب نرنجن ندی کے کنارے پہنچا تو برگد کے ایک درخت کے نیچے آسن جما کر بیٹھ گیا اور جی میں ٹھان لی کہ چاہے اُس کے جسم کی ہڈّیاں تک گل سڑ جائیں وہ اِس جگہ سے اُس وقت تک نہیں اُٹھے گا جب تک اُسے گیان حاصل نہ ہو جائے۔ آخر برگد کے اُس پیڑ کے نیچے بیٹھے ہوئے گوتم کا دِل و دماغ ایک سچّی روشنی سے روشن ہو گیا اور اُسے معلوم ہو گیا کہ انسان دُکھوں سے نجات کیسے حاصل کر سکتا ہے۔ اب وہ گوتم نہیں، گوتم بُدھ تھا۔ یعنی عقل

مند گوتم۔ اُس وقت اُس کی عُمر پینتیس برس تھی۔

گوتم بُدھ نے انسان کی نِجات کا بھید پا لیا تو وہ لوگوں کو یہ سمجھانے نِکل کھڑے ہوئے کہ نِجات کا صحیح راستہ کیا ہے۔ پہلے اُنہیں آلار کلامہ اور اُواکہ کا خیال آیا مگر معلوم ہوا کہ وہ دونوں اِس دُنیا سے سِدھار چُکے ہیں۔ پھر اُن کے ذہن میں وہ پانچ آدمی آئے جو ریاضتوں اور چِلّوں کے دوران اُن کے شاگرد بن گئے تھے مگر پھر اُنہیں چھوڑ کر چلے گئے تھے۔ گوتم بُدھ اُن سے ملنے کاشی گئے اور اُن کو نجات کی وہ راہ دِکھائی جو خود اُنہیں نظر آئی تھی۔ گوتم بُدھ نے اُن سے کہا!

"اپنے من کو مار کر نجات حاصل نہیں کی جا سکتی۔ نجات وہ حاصل کرے گا جو جسم کا بھی خیال رکھے گا۔ جو شخص خواہش کے بندھن سے آزاد نہیں ہے، اُس کو صرف گوشت مچھلی سے پرہیز کرنے، سر مُنڈوانے، کپڑے نہ پہننے، کمبل اُوڑھنے رہنے اور جسم پر بھبھوت ملنے سے نجات حاصل نہیں ہو سکتی۔ اِسی طرح کوئی انسان منتر پڑھنے، خیرات کرنے اور پانی میں کھڑے رہنے سے پاک نہیں

ہو جاتا۔ جب تک انسان ”میں“ کے بس میں ہو کر دُنیا کی خوشی کے پیچھے مارامارا پھِر رہا ہے، اُس وقت تک صرف جسم کو تکلیفیں دینے سے نجات حاصل نہیں ہو سکتی۔ نجات تو وہ حاصل کرے گا جو اپنے جسم کی ضرورتوں کے مطابق کھائے پیئے، لیکن اپنی ”میں“ کو مار دے۔ یاد رکھو! یہ دُنیا دُکھوں کا گھر ہے اور یہاں دُکھ اور غم کی اصل وجہ عیش اور آرام کی خواہش ہے۔ غم اور دُکھ پر قابو پانے کے لیے سچّا یقین، سچّا خیال، سچّا عمل، سچّی روزی، سچّی کوشش، سچّی توجّہ، سچّی گُفتگُو اور سچّی سوچ بچار ضروری ہے۔

گوتم بُدھ کی یہ باتیں سُن کر وہ پانچوں اُن کے ساتھی بن گئے۔ اُس وقت برسات کا موسم تھا۔ اِس موسم کے تین مہینے گوتم بُدھ نے کاشی میں گزارے اور لوگوں کو اپنی طرف بُلاتے رہے۔ کاشی میں ساٹھ آدمیوں نے گوتم بُدھ کا مذہب قبول کیا۔

جو لوگ گوتم بُدھ کا مذہب اختیار کر کے بُدھ مت میں شامل ہوتے تھے، انہیں

پھر بھیک مانگ کر پیٹ بھرنے والے کہا جاتا تھا۔ گوتم بُدھ کے نزدیک اپنی ”میں“ کو ختم کرنے اور اپنی طبیعت میں عاجزی پیدا کرنے کے لیے اَوروں سے بھیک مانگنا ضروری تھا۔

لوگ بُدھ کی طرف یُوں کھنچے چلے آئے جیسے لوہا مقناطیس کی طرف کھنچا چلا آتا ہے۔ اُن کی باتوں میں سادگی بھی تھی اور کشش بھی۔ اور پھر وہ لوگوں کی عام بول چال کی زبان میں باتیں کرتے تھے اور یہ باتیں آسانی سے ہر کسی کی سمجھ میں آجاتی تھیں۔

اور جب گوتم بُدھ لوگوں کو نجات کی راہ دِکھاتے اپنے چیلوں کے ساتھ مگدھ کی راجدھانی راج گڑھ پہنچے تو شاہی محل کے دروازے پر اُنھوں نے خود بمبی سار کو اپنا انتظار کرتے پایا۔ بمبی سار نے گوتم بدھ اور اُن کے چیلوں کو محل میں کھانا کھلایا اور اِس کے بعد زمین کا ایک اچھّا سا ٹکڑا اُن کے نام کر دیا۔

مگدھ کے علاوہ کوشل، انگہ، بنگہ، آونتی، کوسمبھی اور دوسری ریاستوں میں گوتم

بُدھ کا پیغام بڑی تیزی سے پھیل رہا تھا۔ ذات پات اور رسم و رواج کے بندھنوں میں جکڑے ہوئے لوگوں کے لیے اِس پیغام میں بڑی کشش تھی۔ یہ وہ پیغام تھا جسے وہ خود سُن سکتے تھے، خود سمجھ سکتے تھے اور اس پر عمل کر سکتے تھے۔ اِس کے لیے وہ کسی برہمن، کسی پنڈت، کسی پروہت، کسی پُجاری کے محتاج نہ تھے۔

گوتم بُدھ کی شہرت جب کپل وستو پہنچی تو راجا شدھودھن نے کئی آدمی بھیجے اور گوتم بُدھ کو کپل وستو آنے کی دعوت دی مگر گوتم بُدھ کی باتوں میں کُچھ ایسی کشش تھی کہ جو کوئی بھی آیا وہ اُنہی کا ہو رہا۔ سات سال میں ایک نہ دو، پورے نو آدمی راجا شدھودھن کا پیغام لے کر گوتم بُدھ کے پاس آئے لیکن وہ اتنا بھی نہ بتا سکے کہ اُنہیں کِس غرض سے بھیجا گیا ہے۔

آخر شدھودھن نے گوتم کے ایک بچپن کے ساتھی کو اُن کے پاس بھیجا۔ اُس کی زبانی تمام حالات سُن کر گوتم بُدھ کپل وستو گئے اور وہاں اُن کے سارے خاندان نے بُدھ مَت قبول لیا۔

کپل وستو میں کُچھ دِن ٹھہرنے کے بعد گوتم بُدھ انومہ اور پھر وہاں سے راج گڑھ واپس آئے۔ اِس کے بعد اُنہوں نے ویسالی کا دورہ کیا جہاں کے لچھوی سرداروں نے اُن کی بڑی آؤ بھگت کی۔ اُس کے بعد وہ دوبارہ کپل دستو گئے۔ پہلی دفعہ وہ اِس لیے گئے کہ ساکیہ اور لوکیہ قبیلوں میں صُلح کروائیں جو دریا کے پانی کی خاطر ایک دوسرے کے خُون کے پیاسے ہو رہے تھے۔ گوتم بُدھ نے اُن میں صُلح کرا دی۔

دوسری دفعہ وہ کپل وستو اُس وقت گئے جب راجا شدھودھن بیمار پڑا اور اُس کے بچنے کی کوئی آس نہ رہی۔ گوتم بُدھ جس دِن کپل وستو پہنچے اُس سے اگلے دِن راجا شدھودھن اِس دُنیا سے کوچ کر گیا۔ اُس وقت اُس کی عمر ستانوے برس تھی۔ شدھودھن کی موت کے ساتھ ہی شاکیہ قوم کا شاہی خاندان ختم ہو گیا، کیونکہ اُس قوم کے سب لوگ بُدھ مَت قبول کر کے بھکشو بن چُکے تھے۔

جب گوتم بُدھ کا پیغام تیزی سے پھیلنے لگا تو جہاں لوگ اُن کے چیلے بنتے جا رہے

تھے، وہیں اُن کے دشمن بھی پیدا ہونے لگے۔ اِس دُشمنی میں ہندو پنڈت اور برہمن سب سے آگے تھے، کیوں کہ گوتم بُدھ کے پیغام سے اُن کی طاقت پر سخت زَد پڑی تھی۔ برہمنوں اور پنڈتوں کی مخالفت کا نتیجہ یہ ہوا کہ شہروں میں لوگ بُدھ بھکشوؤں سے نفرت کرنے لگے اور جب وہ بھیک مانگنے نکلتے تو اُن کو بُرا بھلا کہتے۔ بھکشوؤں نے گوتم بُدھ کو یہ ماجرا بتایا تو وہ بولے!

”سنو! اے بھکشوؤ! لوگوں کے مُنہ سے بُرا بھلا سُننے اور ان کے ہاتھوں دُکھ اُٹھانے میں ہی تمہارا بھلا ہے۔ یاد رکھو تمھارے پاس سچّائی کا جو ہتھیار ہے اُس کا کوئی توڑ نہیں۔ اُس کے بل پر ہماری تعداد بڑھتی ہی جائے گی۔“

اُسی زمانے میں وردھمان مہاویر نے بھی ذات پات اور رسم و رواج کے خلاف بغاوت کی تھی اور جین مت کی بنیاد رکھی تھی۔ اُن سے بھی بہت عرصہ پہلے تریسٹھ مختلف لوگوں نے دُکھی انسانوں کو نجات کا راستہ دِکھانے کے لیے شہر شہر، بستی بستی پھر کر لوگوں کو نیکی کی طرف بُلایا تھا۔ مگر قُدرت نے جو عزّت اور

کامیابی گوتم بُدھ کو دی، وہ اور کسی کے حصّے میں نہیں آئی۔ یُوں بھی گوتم بُدھ اور اُن کے چیلوں کو اپنے دُشمنوں اور مخالفوں کے ہاتھوں جو تکلیفیں اُٹھانا پڑیں، وہ بڑی سخت تھیں اور اُن سے پہلے لوگوں کو اتنی مخالفت کا سامنا نہیں کرنا پڑا تھا۔

مگر اِن تمام مخالفتوں کے باوجود گوتم بُدھ اور اُن کے چیلوں نے ہمّت نہ ہاری اور پورے جوش و خروش کے ساتھ اپنا پیغام لوگوں تک پہنچاتے رہے۔ آخر اسّی برس کی عُمر میں گوتم بُدھ نے اِس دُنیا سے مُنہ موڑا۔ اُس وقت گوتم بُدھ اپنے خاص چیلے چندہ لوہار کے ہاں ٹھہرے ہوئے تھے۔ مرنے سے پہلے اُنہوں نے کہا:

”اے دُنیا تو فانی ہے۔ میں تیرے دیکھنے والوں سے التجا کرتا ہُوں کہ تیری طرف نہ دیکھیں، اپنی نجات کی طرف دیکھیں۔ اے دُنیا والو! یہ جسم اور اس دُنیا کی ہر چیز مِٹ جانے والی ہے۔ صرف سچّائی ہمیشہ رہنے والی ہے۔ محنت اور کوشش سے اپنی نجات کا سامان کرو۔“

پاٹلی پُتر پہنچ کر سارنگ بابا، انوشا اور اُوشا کے ساتھ کیا واقعات پیش آئے چندر گُپت کی امداد کے لیے اُنہوں نے کیا کُچھ کیا؟ سُدھانند سے یوگانند تک مگدھ کی راج گدّی نے کِس کِس کے خُون کی قُربانی لی؟ چندر گُپت قاتِل حلوائی کے پنجے سے کیسے بچا اور اُس حلوائی کے خلاف انسانی کھوپڑیوں نے کیسے گواہی دی؟ یہ سب کُچھ جاننے کے لیے انوشا کی آپ بیتی کا پانچواں حصّہ ''انوشا پاٹلی پُتر میں'' پڑھیے۔